

جاسوسی دنیا نمبر 4

تجوری کا راز

(کھل ناول)

حیرت انگیز ڈاکہ

تقریباً رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سارے شہر میں خاموشی طاری تھی۔ بازار میں
 کا دکا پان کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید پان والوں کو ان گا کہوں کا انتظار تھا جو سیکنڈ شوڈیکھ
 کر لوٹے وقت پان خریدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ ٹرک سناٹے کا سینہ چیرتا سنسان
 لوگوں پر دوڑتا نظر آجاتا تھا۔ سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سردی ہی کی وجہ سے شہر اتنی
 جلدی سناٹے سے ہم آغوش ہو گیا تھا ورنہ گرمیوں میں عموماً شاہراہوں پر تقریباً رات بھر
 آمدورفت رہتی مگر اس وقت یہ عالم تھا کہ شہر کے مشہور سینٹھ اگر وال کی کوشی شہر کے سب سے
 بڑے روڈ پر واقع ہونے کے باوجود بھی پراسرار آدمیوں کو اپنے اندر داخل ہونے سے نہ روک

یہ دونوں ایک چھوٹی سی خوبصورت کار میں بیٹھ کر آئے تھے جسے وہ سڑک کے دوسرے
 کنارے پر چھوڑ کر کوشی کی دیوار سے آگے تھے۔ اس دیوار کے قریب بہت زیادہ اندھیرا تھا۔
 دونوں نے چونکہ سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اس لئے وہ اس تاریکی میں اس طرح گم

ہو گئے تھے جیسے دودھ میں پانی۔ ان میں ایک زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور دوسرا اس کے کانٹے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد بیٹھا ہوا آدمی آہستہ آہستہ سے اٹھنے لگا۔ اوپر والے نے بارہ تیرہ فٹ اونچے روشندان میں ہاتھ ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے لمحہ میں وہ روشندان کے اوپر تھا۔ اس نے روشندان کا شیشہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں نیلے رنگ کی دھندلی روشنی والا بلب روشن تھا۔ شاید اس شخص کی قسمت یاد تھی کہ اسے ٹھیک روشندان کے نیچے لگی ہوئی ایک اونچی میز مل گئی، وہ آہستگی سے اس کے اوپر اتر گیا۔

اب باہر ایک آدمی رہ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رہنکتا ہوا صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ صدر دروازے پر ایک بلب روشن تھا یہاں اس کی روشنی میں اس کا چھپنا محال تھا۔ لہذا وہ سچ سڑک پر آکھڑا ہوا۔ اس نے اپنے چتر کے کالرکانوں سے اونچے کر رکھے تھے اور نلک ہیٹ چہرے پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کے خدوخال تاریکی میں چھپ کر رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے میں ڈراسی درز ہوئی اور باہر کھڑا ہوا آدمی ادھر ادھر دیکر تیزی سے چلتا ہوا صدر دروازے کے قریب آیا۔ صدر دروازہ کھلا اور وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے کوشی کے اندر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تاریکی میں چھپتے چھپاتے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی تھی۔ ایک جگہ انہیں اوپر کی منزل میں کسی کمرے کے دروازے کے دھندلے شیشوں میں روشنی دکھائی دی۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں انہوں نے ٹارچ روشن کی۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں بے شمار صوفے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قد آدم تصویریں تھیں اور فرش پر قیمتی قالین، اوپر جانے کے لئے ایک طرف سنگ مرمر کے زینے تھے، ہال میں سناٹا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ زینوں پر چڑھنے لگے، انہوں نے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا جس کے دروازوں کے شیشوں سے روشنی چھن رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا ان میں سے ایک نے دروازے کو آہستہ سے کھولا۔

اگر وال دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ یہ دونوں اتنی آہستگی سے کمرے میں داخل

ہئے کہ سیٹھ اگر وال کو خبر تک نہ ہوئی۔

”سیٹھ جی.....!“ ایک نے آہستہ سے کہا۔

سیٹھ اگر وال چونک کر مڑا..... اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ ایک نے ریوالور نکال لیا۔

”منہ سے آواز نہ نکلے.....!“ ریوالور والے نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

سیٹھ اگر وال کے چہرے کا رنگ اڑ گیا لیکن وہ جی کڑا کر کہ بولا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔“

”ڈرو نہیں..... اگر خاموشی سے بیٹھے رہے تو ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔“ دوسرے نے کہا۔

”تم لوگوں نے یہاں آ کر غلطی کی.....!“ سیٹھ اگر وال نے کہا۔ ”یہاں تمہیں کچھ زیادہ

دل سکے گا میں سب کچھ بینک میں رکھتا ہوں۔“

دونوں ہنسنے لگے۔

”ہم لوگ معمولی چور یا ڈاکو نہیں.....!“ دوسرا آدمی بولا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کی

الف مڑ کر کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔“

وہ ایک چھوٹے سے دروازہ کی طرف بڑھا۔

”ادھر کہاں جاتے ہو.....!“ اگر وال نے کہا۔ ”وہ میرے سونے کا کمرہ ہے۔“

”اور وہیں تم نے اپنی تجوری رکھ چھوڑی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”لیکن اس کی کئی نیچے ہے۔“ اگر وال بولا۔

”مجھے کئی نہیں چاہئے.....!“ دوسرے نے کہا اور دروازہ کھول کر کمرے میں چلا گیا۔

ایک آدمی ریوالور لئے ہوئے بدستور سیٹھ اگر وال کے پاس کھڑا رہا۔

سیٹھ اگر وال نے کئی بار اسے دھوکہ دے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پستول کی نال

کی کٹی سے ٹکرائی۔

”دیکھو سیٹھ صاحب! اگر تم نے زیادہ گڑبڑ کی تو تمہیں یہیں ختم کر دیا جائے گا۔ تم یہ نہ

سمجھنا کہ یہ محض دھمکی ہے۔ یہ ریوالور بغیر آواز کا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی، اور ہم تمہیں مار کر چلتے نہیں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم لوگ خواہ مخواہ جھک مار رہے ہو!“ سیٹھ اگر وال نے کہا۔
”ججوری میں دو تین ہزار سے زیادہ تمہیں نڈل سکے گا۔“

”خیر..... یہ ہمارا اپنا سودا ہے، تمہیں اس سے کیا۔“

سیٹھ اگر وال خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں اپنے سونے کے کمرے کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی نے بارہ بجائے، دوسرا آدمی ابھی تک اگر وال کے سامنے لے کمرے ہی میں تھا۔ سڑک پر سینکڑوں لوگ کھڑے والوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آدمی کمرے سے نکل آیا۔

”کہتے استاد کیا رہا۔“ پہلا آدمی بولا۔

”ٹھیک ہے.....!“ دوسرے نے کہا۔ ”لاؤ پستول اب مجھے دو اور تم سیٹھ جی کو کرسی پر باغداد دو اور انکے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ تاکہ یہ ہمارے جاتے ہی شور نہ مچانا شروع کر دیں۔“
پہلے آدمی نے دوسرے کے ہاتھ میں پستول دے دیا اور خود ریشم کی پتلی ڈور سے بندھا کر وال کو کرسی میں جکڑنے لگا۔

”میرے منہ میں کپڑا مت ٹھونسو میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہیں چیخوں گا۔“ سیٹھ اگر وال نے کہا۔

”سیٹھ جی..... اگر تم اتنے ہی ایماندار ہوتے تو ہمیں تکلیف کرنے کی ضرورت ہی ہوتی۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

پہلے آدمی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

دونوں ابھی ہال میں پہنچے ہی تھے کہ بچاؤ بچاؤ، دوڑو دوڑو کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ شاید اگر وال نے کسی طرح سے اپنے منہ سے کپڑا نکال لیا تھا اور اب وہ بے تکان رہا تھا۔ دفعتاً اندھیرے میں دو تین آدمی دوڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔

”شاید سیٹھ جی کے کمرے سے آواز آرہی ہے۔“ ایک آواز سنائی دی۔

”ہاں چلو اوپر چلیں.....!“ دوسری آواز آئی اور زینہ پر قدموں کی آہٹ معلوم ہونے لگیں۔

”استاد اب کیا کیا جائے۔“ ایک نے کہا۔

”چلو جلدی کرو..... صدر دروازہ کی طرف۔“

”مگر شاید باہر بھی آدمی جمع ہو گئے ہیں۔“

”ڈرو نہیں..... آگے بڑھو..... میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“

دونوں تیزی سے صدر دروازہ پر پہنچے جو اندر سے بند تھا۔ باہر بھی شور سنائی دے رہا تھا۔

”شاید لوگ دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

استاد نے دروازہ پر پہنچ کر چیخنا شروع کر دیا۔

”ہائے مار ڈالا..... مار ڈالا..... مار ڈالا..... بچاؤ..... بچاؤ.....!“

لوگ باہر سے دروازہ پھینٹنے لگے۔

استاد نے چیخنے ہوئے دروازہ کھول دیا اب پہلے آدمی نے بھی اپنے استاد کی تقلید شروع کر دی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔

لوگ ”کیا ہے..... کیا ہے“ کہتے ہوئے اندر گھسنے لگے اور یہ دونوں بچاؤ بچاؤ چیخنے ہوئے باہر نکل گئے۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

”ارے وہ کار میں بیٹھ گئے..... پکڑو..... پکڑو..... وہی تو ہیں.....!“ سیٹھ اگر وال اوپر کی کھڑکی سے سر نکالے چیخ رہا تھا۔

جیسے ہی لوگ کار کی طرف جھپٹے استاد نے نوٹوں کا بٹل کھول کر مجمع پر پھینک دیا۔ فضا میں سینکڑوں نوٹ اڑ رہے تھے۔ مجمع بے تحاشہ نوٹوں کی طرف جھک پڑا اور کار جواب اشارت ہو چکی تھی یہ جاہد جا۔ نظروں سے غائب ہو گئی۔

نئی الجھنیں

دوسرے دن صبح جب سارجنٹ حمید اور انسپٹر فریدی سیر کے لئے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو کرنے سب انسپٹر جگدیش کا ملاقاتی کارڈ لاکر دیا۔

”مجھے افسوس ہے انسپٹر صاحب کہ میں ناوقت محل ہوا۔“ جگدیش نے اندر داخل ہو کر کہا۔
”آؤ..... آؤ بھی کوئی بات نہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”خیریت تو ہے آپ کچھ بدحواس سے نظر آ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”خیریت کہاں حمید بھائی.....!“ جگدیش نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”انسپٹر صاحب کی مہربانی سے میرے افسر مجھے بہت زیادہ سمجھنے لگے ہیں اور یہ چیز میرے لئے وبال جان بن گئی ہے۔“
فریدی ہنسنے لگا۔

”آؤ خیر کہو تو کیا بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا عرض کروں..... رات ایک عجیب و غریب واردات ہو گئی۔ جس کی تفتیش میرے ذمہ ڈالی گئی ہے اور میں جو کچھ ہوں میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ ابھی مجھ میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ کسی معمولی چوری کا سراغ لگا سکوں۔“

”خیر..... چلو آگے کہو۔“

”کل رات سینٹھ اگر وال کے یہاں دو آدمی گھس آئے ان میں سے ایک سینٹھ اگر وال کے سر پر پستول تانے کھڑا رہا اور دوسرا ان کے سونے کے کمرے میں گھس گیا جہاں تجوری رکھی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آ گیا۔ دونوں نے اگر وال کو کرسی میں جکڑ کر ان کے منہ میں کپڑے اٹھوئیں دیا۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اگر وال نے منہ سے کسی طرح کپڑا نکال لیا اور چیخنے لگا۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجے ہوں گے سینٹھ شختم ہوئے تھے اس لئے سڑک پر بھی کافی آمدورفت ہو گئی تھی۔ اگر وال کے چیخنے پر ایک طرف تو ان کے گھر والے بیدار ہو گئے اور دوسری طرف سڑک پر ان کے صدر دروازے پر کافی ہنر

لگ گئی۔ دونوں آدمیوں نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی چور، چور چلاتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگے۔ اسی حالت میں انہوں نے صدر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے وقت انہوں نے چننا شروع کر دیا۔ ارے مار ڈالا، ارے مار ڈالا..... لوگ سمجھے کہ شاید وہ بھی اسی کوشی کے رہنے والے ہیں لیکن اگر وال کے چلانے پر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ بد معاشوں کی موڑ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ان دونوں نے دو تین ہزار روپوں کے نوٹ مجمع کی طرف پھینک دیئے، لوگ نوٹوں کی طرف پلٹے اور وہ دونوں کار اسٹارٹ کر کے چلتے رہے۔“

”بھئی بہت خوب.....!“ فریدی بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”وہ چاہے جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن میں ان کی ذہانت کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا بھی کمال کر دیا۔“

”یہی نہیں اور سنئے.....!“ جگدیش نے کہا۔ ”ادھر وہ لوگ فرار ہوئے اور ادھر کسی نے پیچھے سے اگر وال پر پستول سے حملہ کر دیا۔ فائر گھر کے اندر سے ہوا تھا، گولی داہنے بازو کو چھید گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ بڑی پر کوئی ضرب نہیں آئی وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں۔“

”تو یہ فائر ان دونوں کے فرار ہو جانے کے بعد ہوا تھا۔“

”جی ہاں.....!“

”اچھا تجوری تو بالکل صاف ہو گئی ہوگی سینٹھ صاحب کی۔“

”یہی تو تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں نے تجوری میں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”سینٹھ اگر وال کا بیان ہے کہ تجوری کی ساری چیزیں جوں کی توں موجود ہیں اور کمرے سے کوئی اور چیز بھی چوری نہیں ہوئی۔“

”تب تو یہ کیس واقعی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔“

”بہت دلچسپ.....!“ جگدیش نے کہا۔

”خیر بھئی اب تو چائے کا وقت بھی ہو گیا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حمید چائے منگواؤ..... تو

پھر تم نے کیا کیا۔“ فریدی نے جگدیش سے پوچھا۔

کر اچھل پڑے گا۔ واردات کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کر دے گا کچھ دیر تک ناک بھوں پر زور دے گا اور پھر اٹھ کر ٹہلے گا۔ لیکن ان سب باتوں کے خلاف اس وقت فریدی کا رویہ دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اصل موضوع کو چھوڑ کر وہ نہ جانے کہاں کے بکھیڑے نکال بیٹھا تھا اور اب حمید اور فریدی میں بالکل نجی قسم کی باتیں چھڑ گئی تھیں۔ فریدی اسے چڑا رہا تھا اور وہ جھلا جھلا کر جواب دے رہا تھا۔ جلدیش نے پھر اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کی۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ جلدیش نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔
 ”آ خر مجرم آئے کس نیت سے تھے۔ کیا انہوں نے محض اس لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا کہ مکان میں صرف ٹہل کر واپس چلے جائیں۔“

”اتنی معمولی سی بات بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔“ حمید نے کہا۔ ”مقصد اصل میں سیٹھ اگر وال کو قتل کرنا تھا، مجرم یقیناً دو سے زیادہ رہے ہوں گے۔ دو نے بھاگ دوڑ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور تیسرے نے سیٹھ پر گولی چلائی اور اسی ہنگامہ میں وہ بھی نکل بھاگا۔“
 فریدی مسکرانے لگا۔

”کیا بچنے کی باتیں کر رہے ہو۔“ فریدی نے سگار کاش لے کر کہا۔ ”اگر قتل ہی کرنا تھا تو اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت تھی ان دونوں نے جس طرح خاموشی سے سیٹھ اگر وال کو کرسی میں باندھ کر اس کے منہ میں کیڑا ٹھونس دیا تھا اسی طرح اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار بھی سکتے تھے۔ وہ لوگ جو اتنی ذہانت کا ثبوت دے کر نکل بھاگے ہوں اتنے لغو پلاٹ نہیں بنا سکتے۔“
 ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ جلدیش جلدی سے بولا۔

”اصل میں جو چیز زیادہ حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ اتنے چالاک آدمیوں نے سیٹھ کو اتنی بد احتیاطی کے ساتھ کیوں بے بس کیا کہ وہ ان کے پیٹھ پھیرتے ہی آزار ہو کر چیخنے لگا۔ جو لوگ اتنے ذہین ہوں کہ تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ان پر نوٹ برسا دیں ایسی حماقت نہیں کر سکتے۔“

”اتنی یہ بات بھی سوچنے والی ہے۔“ جلدیش نے کہا۔

”کرنا ہی کیا..... مجھے آتا ہی کیا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں پر رعب ڈالنے کے لئے آتھی شیشہ سے مجرم کی انگلیوں کے نشانات تلاش کرنا رہا۔ دو چار لٹے سیدھے سوالات سیٹھ صاحب کے گھر والوں سے کئے۔ خود سیٹھ کا بیان لیا اور بس۔“

”خیر کوئی پریشانی کی بات نہیں..... کام کرنے ہی سے آتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں..... مگر.....!“

”اوہ..... مگر کیا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”لو چائے پیو..... شاید تم رات بھر جاگے ہو۔ ناشتہ کر کے یہیں سو رہو اور اب تو تم اپنے حلقہ کے آفسرانچارج ہو۔ تمہیں اتنی محنت نہ کرنی چاہئے۔ اتنی جلدی ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس۔ پی بننے کے خواب نہ دیکھو۔“

”اگر آپ اسی طرح مجھ پر مہربان رہے تو اس دن کو بھی دور نہیں سمجھتا۔“ جلدیش نے کہا۔
 ”جلدیش صاحب..... آپ خواہ مخواہ غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”جو شخص خود آج تک چیف انسپکٹر نہ ہو سکا وہ کیا کسی کو ترقی دلا سکے گا۔“

”شاید تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ آج تک سار جنت ہی رہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کر سکتا.....!“ حمید نے جواب دیا۔

”حمید تم آج انسپکٹر ہو سکتے ہو لیکن یہ سمجھ لو کہ پھر تم ایک جگہ نہ رہ سکیں گے۔“ فریدی

نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ تمہیں انسپکٹری عزیز ہے یا فریدی۔“

”اب میں کیا عرض کروں..... خود ہی سمجھ لیجئے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں.....“

چاپلوس واقع ہوا ہوں۔“

فریدی اور جلدیش ہنسنے لگے۔

”اچھا تو پھر انسپکٹر بنو ہی دیا جائے۔“

”نہیں معاف رکھئے۔ رات میں جو تین چار گھنٹے سو لیتا ہوں اس سے بھی جاؤں۔“

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔“

یہاں آتے وقت جلدیش راستہ بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ فریدی ایسا عجیب و غریب کیس کا

”یہاں کون سی ایسی بات ہے جو سوچنے والی نہیں ہے۔“ حمید بولا۔

”ہاں یہ تو بتاؤ۔“ فریدی نے جگدیش سے کہا۔ ”مجرموں نے جو نوٹ پھینکے تھے ان میں سے کوئی نوٹ تمہیں بھی دستیاب ہوا۔“

”جی ہاں..... ایک سو روپے کا نوٹ ہے!“ جگدیش نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ نوٹ ایک پان والے کو ملا تھا جس کی دوکان سیٹھ اگر وال کی کوچھی کے قریب ہی ہے۔“

فریدی نوٹ لے کر دیکھتا رہا۔

”اس پر ایمیریل بینک کی مہر پڑی ہوئی ہے۔“ فریدی بولا۔

”میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ اس نوٹ کو لے کر ایمیریل بینک جاؤں۔“ جگدیش نے کہا۔

”بہت ممکن ہے کہ یہ اب سے ایک سال قبل وہاں سے ایشو کیا گیا ہو۔ اس طرح پتہ

چلنا محال ہے۔“

”پھر آخر بتائیے کہ میں کیا کروں۔“ جگدیش نے کہا۔

”دھیرج دھیرج.....!“ فریدی فہم کر بولا۔ ”آخر اتنی جلدی کیوں ہے۔ اس سے بھی

معمولی قسم کی وارداتوں میں مہینوں خاک چھانی پڑتی ہے۔“

”تم ایک ہی دن میں تاج محل کیوں تعمیر کر ڈالنا چاہتے ہو۔“

”اچھا تو صاحب..... اب میں جا کر سوتا ہوں۔ یہ کیس میرے بس کا روگ نہیں اور میں

یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اپنی نااہلی کا ثبوت دوں، اگر آپ نے مجھے حلقہ کا آفیسر انچارج بنا کر اس

جنگل میں پھنسا دیا ہے تو آپ ہی اسے بھی سنبھالئے۔“

”بھئی میں تمہاری مدد کے لئے ہر وقت تیار ہوں.....!“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن اس کی

کیا صورت ہوگی۔ رام سنگھ والے کیس کی اور بات تھی معاملہ کسی نہ کسی طرح نہ ہی گیا یہاں

دشواریاں پیش آسکتی ہیں اور پھر اگر کسی طرح بھانڈا پھوٹ گیا تو تمہاری بڑی بھد ہوگی۔ دپے

میں تمہیں ہر قسم کے مشورے دینے کے لئے تیار ہوں۔“

”خیر کچھ سہی..... آپ کی مدد کے بغیر یہ گاڑی چلتی نظر نہیں آتی۔“

”میں پہلے ہی کہہ چکا کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ مگر اس سلسلہ میں کوئی ایسا اقدام نہیں

کر سکتا جس سے تمہاری اس شہرت کو دھکا لگے جو تم نے رام سنگھ والے کیس میں حاصل کی ہے۔“

”اچھا تو پھر اب میں چلوں۔“ جگدیش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ذرا اس نوٹ کا نمبر تو مجھے لکھوا دو۔“ فریدی نے الماری پر سے نوٹ بک اٹھاتے

ہوئے کہا۔ جگدیش نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نمبر لکھ کر فریدی نے وہ نوٹ اسے پھر

یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ تم بینک مت جانا، ورنہ خواہ مخواہ اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے کام

خراب کر دو گے۔ جگدیش کے چلے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”کہنے کیا خیال ہے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

فریدی بھی بے اختیار مسکرا پڑا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر گولی کس نے چلائی۔“ فریدی نے کہا۔

”یہی تو سوچنے کی بات ہے۔“ حمید بولا۔ ”لیکن آخر یہ آپ کو سوچھی کیا تھی۔“

”ہر بات اگر تمہاری سمجھ میں آنے لگے تو بات ہی کیا رہ گئی۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر پکڑ لئے گئے تو کیا حشر ہوگا۔“

”برخوردار دو ہزار روپے کا خون اس لئے نہیں کیا تھا کہ پکڑ لئے جائیں۔“

مگر عین وقت پر آپ کو سوچھی خوب..... میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

”عین وقت پر نہیں سوچھی..... میں اس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو کر گیا تھا۔ ورنہ یونہی

خواہ مخواہ دو ہزار کے بنڈل جیب میں لئے پھرنے کی کیا تک ہے۔“

”بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بخیر و خوبی نکل آئے۔“ حمید نے کہا۔

”اور یہ سارا اہل محض تمہاری وجہ سے ہوا، میں نے تو تم سے اسے باندھنے کیلئے کہہ کر سخت

غلطی کی تھی، یہ کام مجھے ہی کرنا چاہئے تھا۔ ورنہ وہ کیا اس کا باپ بھی آواز نہیں نکال سکتا تھا۔“

”اس کا باپ تو واقعی آواز نہ نکالتا۔ لیکن خدا را یہ بتائیے کہ آخر آپ نے یہ سب کس

کچھ سو روپے کے نوٹ بھی رہنے دیئے تھے حالانکہ مجھے یہ نہ کرنا چاہئے تھا۔ بینک سے سو روپے کے نوٹ نمبر لکھے بغیر ایٹھ نہیں کئے جاتے۔ اگر جلدیش نے اس کے متعلق چھان بین شروع کر دی ہوتی تو بڑی مشکل آپڑتی۔ میں نے پرسوں ہی بینک سے یہ روپے منگوائے تھے۔

مجھے امید ہے کہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ خود بینک نہ جائے گا۔

”اگر یہی بات تھی تو پھر آپ نے وہ نوٹ اسے واپس کیوں کر دیا۔“

”گھبراؤ نہیں..... وہ پھر میرے پاس واپس آ جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ کیسے.....؟“

”نہایت آسانی سے..... میں نے جو پروگرام اس وقت بنایا ہے اس پر عمل کئے بغیر کام نہ چلے گا لیکن اس کے لئے خصوصاً تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔“

”آپ پھر گول مول باتیں کرنے لگے۔“

”اچھا تو خیر سنو..... اب ہمیں متواتر کئی دنوں تک مختلف مقامات پر اپنی رات والی حرکت دہرائی پڑے گی۔“

”ارے واہ..... ارے واہ..... واہ.....!“

”بس نکل گئی جان.....!“ فریدی نے کہا۔ ”اس کا ذمہ میں لیتا ہوں کہ تم پکڑے نہ جا سکو گے۔“

”میں کہتا ہوں آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”بھی تمہیں اس سے کیا بحث..... اگر میرا ساتھ دے سکتے ہو تو خیر، میں زبردستی مجبور نہ کروں گا۔“

”میری جان عجیب مصیبت میں پڑ گئی۔“ حمید بولا۔

”نہیں اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم انکار کرنا چاہو تو بخوشی کر سکتے ہو۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہ ہوگا۔“

”خیر جہاں آپ وہاں میں..... لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ کے بیان کے مطابق جب

لئے کیا تھا۔“

”ابھی نہیں..... جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اگر وال پر گولی کس نے چلائی تھی، میں کچھ نہ بتاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت تک اختلاج میں مبتلا رہوں۔“ حمید نے کہا۔
”نہیں، تم اس دوران میں خمیرہ مروارید اور عرق مشک استعمال کر سکتے ہو۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”اچھا یہی بتا دیجئے کہ آپ نے اس تجویز سے کیا چیز نکالی تھی جس کا اسے بھی علم نہیں۔“
”کمال کیا تم نے، اسے علم کیوں نہیں..... وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”چلئے اب تو آپ نے اور بھی الجھا دیا۔“ حمید نے کہا۔ ”آخر آپ مجھ سے یہ راز کیوں چھپا رہے ہیں جبکہ میں آپ کا شریک کار بھی ہوں۔“
”بات دراصل یہ ہے کہ اگر میں تمہیں بتا دوں تو اس معاملہ میں تمہاری ساری دلچسپی ختم ہو جائے گی اور تم اچھی طرح کام نہ کر سکو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی دلچسپی ختم نہ ہونے دوں گا۔“ حمید نے کہا۔
”دلچسپی لینا یا نہ لینا اپنے بس کی بات نہیں۔ جتنی زیادہ جو چیز ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے اتنا ہی ہم اسے بے نقاب کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں اور اس کے ظاہر ہو جانے کے بعد خود بخود ہماری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔“

”بہر حال تو آپ نہیں بتائیں گے۔“ حمید نے بے دلی سے کہا۔

”ارادہ تو یہی ہے اور ساتھ ہی یہ امید بھی ہے کہ تم برانہ مانو گے۔“

”اس پر غور کروں گا کہ برانوں یا نہ مانوں.....!“ حمید نے کہا۔ ”اچھا یہی بتا دیجئے کہ آخر آپ نے جلدیش سے نوٹ کا نمبر کیوں لیا ہے۔“

”ہاں یہ بتا سکتا ہوں، مجھ سے ایک بڑی حماقت ہوئی۔ وہ یہ کہ میں نے ان بنڈلوں میں

”آپ پھر غلط سمجھے ہیں۔ میں بہر حال آپ کے ساتھ ہوں گا چاہے آپ وہ کام غلط کر رہے ہوں یا صحیح۔ کہتا تو صرف اتنا ہے کہ جب قانون کے محافظ ہی قانون شکنی پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اوروں کا اللہ ہی مالک ہے۔“

اس بات کو میں شائد تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ فریدی نے بُرا سامنہ بنا کر کہا۔ ”لیکن اب تم پر اس کام کی اہمیت ظاہر ہوگی تو تم بھی قانون کے خلاف جرم کی مدد کرنے پر آمادہ ہواؤ گے۔ لیکن میں ابھی تمہیں اس راز سے آگاہ نہیں کر سکتا۔“

شہر میں ہاپچل

تین دن سے شہر کی پولیس بُری طرح پریشان تھی۔ سینٹھ اگر وال کے واقعہ کے بعد سے اب تک اسی طرح کی دو اور وارداتیں ہو چکی تھیں، شہر کے مشہور دولت مندوں کی تجوریاں کھولی گئیں لیکن کوئی چیز غائب نہ ہو اور تجوریوں کو کھولنے والے صاف بچ کر نکل جائیں۔ اور یہ بھی بہ بات تھی کہ یہ ساری کی ساری وارداتیں جگدیش کے ہی حلقہ میں ہو رہی تھیں۔ جگدیش کئی فریدی سے مل کر اس سے مدد کا خواہاں ہوا۔ مگر ہر بار اس نے دم دلا سر دے کر رخصت کر دیا۔ آج بھی وہ دیر سے بیٹھا فریدی کا دماغ چاٹ رہا تھا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں۔ بڑی بدنامی ہو رہی ہے میری۔ جگدیش نے کہا۔ ”اچھا بھئی تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ آج میرا ارادہ ہے کہ رات میں تمہارے حلقہ کا گشت کروں، مگر یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔“

”ارے نہیں صاحب! کبھی زبان پر بھی نہ لاؤں گا۔ آپ کچھ کیجئے تو.....“ جگدیش نے کہا۔ ”تو کیا آپ ہم لوگوں کے ساتھ گشت کیجئے گا۔“

”تم لوگوں کے ساتھ گشت کرنے سے کیا فائدہ..... تم لوگوں کا طریقہ اگر کارآمد ہوتا تو

کل رات آپ کو کامیابی ہوگئی تو پھر اب ادھر ادھر ہڑ بونگ چمانے سے آپ کا کیا مقصد ہے۔“

”اب تم نے کی ہے قاعدے کی بات..... اچھا سنو..... اب یہ چیز ضروری ہوگئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ نوٹ جگدیش کے قبضہ سے نکالنا ہی ہے ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ کسی مشکل میں پھنس جائیں۔“

”لیکن اس طرح وہ نوٹ ہمیں کیسے مل سکے گا۔“

”جب ہم لوگ اسی طرح کی دو تین عجیب و غریب وارداتیں اور کر گزریں گے تو یہ کیسے خواہ مخواہ سول پولیس کے ہاتھ سے نکل کر ہم تک آئے گا۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ دو ڈاکو بلا مقصد لوگوں کے گھروں میں گھس گھس کر تجوریوں کا جائزہ لیتے پھرتے ہیں۔“

”سوچا تو آپ نے خوب ہے۔ لیکن.....!“

”دیکھو میاں صاف بات..... لیکن ویکن کا میں قائل نہیں۔ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں اسکے متعلق میں نے پہلے ہی سے بہت کچھ سوچ رکھا ہے اور اب تو صرف ہمت کی بات ہے۔“

”خیر صاحب! جیسا بھی کچھ ہوگا دیکھا جائے گا لیکن اتنا تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ شور و غل ہو جانے کے بعد بھاگ نکلنے والی ترکیب تو اب کام نہ دے گی کیونکہ اس وقت تک اس کی شہرت سارے شہر میں ہوگئی ہوگی۔ اس لئے اب لوگوں کو چکر نہ دیا جائے گا۔“

”یہ ضروری نہیں کہ میں وہی پرانی لکیر پیٹتا رہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”اول تو اب ہل ہونے کے امکانات ہی نہ ہونے دوں گا اور اگر اتفاق سے ایسا ہو بھی گیا تو اسی وقت کوئی اور تدبیر کر لی جائے گی اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میرا ذہن ہمیشہ خطرات میں پڑنے کے بعد ہی تیزی سے کام شروع کر دیتا ہے۔“

”بھلا اس حقیقت سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن.....!“

”پھر وہی لیکن.....!“ فریدی نے جھلا کر کہا۔ ”آختر تمہیں لیکن کا خطبہ کیوں ہو گیا ہے۔ میں تو بار بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہاری ہمت نہ پڑتی ہو تو صاف انکار کر دو۔ میں اکیلے ہی یہ کام کروں گا۔“

”آپ کی باتیں آپ جانیں..... یا جانے خدا..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“
 ”اپنی بساط کے مطابق کافی سمجھ لیتے ہو لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے بعد تم ہی
 میری جگہ لو گے۔“

”اچھا تو اب مجھے بھی گھنٹا شروع کر دیا۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ آج کہاں ہاتھ مارا جائے گا۔“

”للا اب پیچھا بھی چھوڑیے۔“

”پیچھا تو اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک کہ یہ کیس میرے ہاتھ میں نہ آجائے۔“

”اس بار شاید ان گدھوں نے بھی قسم کھا رکھی ہے کہ معاملہ ہم تک نہ پہنچے دیں گے۔“

حمید نے کہا۔

”کب تک..... کسی دن کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں گا کہ معاملہ خود بخود ٹھہلنا ہوا ہم تک چلا
 آئے گا۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”تو کیا کوئی نیا گل کھلانے کا ارادہ ہے۔“

”یقیناً..... اگر دو دن کے اندر اندر یہ کیس میرے سپرد نہیں ہوتا تو مجبوراً مجھے کلکٹر
 صاحب کے بنگلہ میں بھی گھنٹا پڑے گا۔“

”اس دن مجھے معاف ہی رکھئے گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”واہ بیٹا..... بڑے اچھے رہے۔ جب امتحان کا وقت آیا تو جان نکل گئی۔ تمہی تو دیکھی
 جائے گی تمہاری بہادری۔“

”لا حول ولا قوۃ.....!“ حمید نے کہا۔ ”کتی بار آپ کو یقین دلا چکا ہوں کہ میں انتہائی
 بزدل ہوں مگر آپ کچھ سہمت نہیں کرتے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم مذاق کرتے ہو۔“

”جی نہیں..... آپ اس طرح مت جان لیا کیجئے۔ میں انتہائی بزدل واقع ہوا ہوں۔“

”اچھا بکواس بند، آج سیٹھ کرم چند کے یہاں..... کیا سمجھے۔“

اتنے دنوں تک خاک کیوں چھاننی پڑتی۔ میں تنہا گشت کروں گا۔ میں نے ان بھاگنے والوں
 نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیا ہے۔“

”تو اچھی بات ہے۔ میں اب مطمئن ہو گیا ہوں..... ممکن ہے رات میں کہیں آپ سے
 ملاقات ہو جائے کیونکہ آج کل میں بھی رات بھر مارا پھرتا ہوں۔“ جگدیش نے کہا۔

”بات ہی ایسی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ ساری وارداتیں
 تمہارے ہی حلقہ میں ہو رہی ہیں۔“

”یہی تو بڑی حیرت کی بات ہے۔“ جگدیش نے کہا۔ ”نہ جانے ان دونوں کو مجھ سے
 کیوں اتنی پر خاش ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کہیں یہ ہمارے ہی حلقہ کے کسی آدمی کی
 شرارت نہ ہو۔ کیونکہ میرا اتنا جلد ترقی کر جانا ہر ایک کو کھٹک رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ انہیں
 میں سے کوئی میری بدنامی کے لئے کوشاں ہو۔“

”تم نے بات تو بہت محقول سوچی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بہت ممکن ہے کہ یہی بات
 ہو، میں بھی اس چیز کو عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے بعض ساتھی تم سے نرمی طرح بے
 لگے ہیں۔“

”جی ہاں یہی تو بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ انکا ہاتھ لگنا کچھ دشوار سا معلوم ہو رہا ہے۔“

”فکرت کرو.....! ہاتھ تو وہ اس طرح لگیں گے کہ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ گے مگر اب
 بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ رازداری شرط ہے۔“

”ارے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں کہ معاملات کو نہیں سمجھتا
 آپ مطمئن رہئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی، اچھا تو اب میں اجازت چاہوں گا۔“

جگدیش کے چلے جانے کے بعد فریدی بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”خوب بیوقوف بنا رہے ہیں آپ بیچارے کو.....!“ حمید نے کہا۔

”بیوقوف نہیں بنا رہا ہوں بلکہ میں اُس کے لئے ترقی کے دروازے کھولنے کی کوشش
 کر رہا ہوں۔“

”تو اور کیا..... اس طرح لوگوں کے گھروں میں گھتے پھرنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”بہت خوب..... یہ نئی دریافت ہے۔ کیا کہنا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”آپ چاہے جتنا بنائیں مجھے تو اب یقین آ گیا ہے کہ یہ آپ کی کچھبھوئی جنسی زندگی ہی کی ایجاد ہے۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔

”دیکھو میاں حمید تم ابھی صاحب زادے ہو۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”تم اس طرح کی گفتگو کر کے مجھ سے میرا راز نہیں اگلا سکتے۔ یہ ساری باتیں تمہیں اسی وقت معلوم ہو سکیں گی جب میں چاہوں گا۔“

حمید جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

”اور اگر تم اس راز کو معلوم کرنے کے لئے اتنے ہی بے چین ہو تو پھر تمہیں وہی کرنا پائے جو میں کہوں۔“

”ارے صاحب تو میں نے انکار کیا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں..... تم شاید سمجھنے لگے ہو کہ تمہارے بغیر میرا کام نہ چل سکے گا۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”لیجئے..... آپ تو پھر ناراض ہو گئے۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں گا۔“

”اچھی بات ہے تو اسی بات پر اب تیاری شروع کر دو۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ٹھیک ایک بجے ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ چھوٹی کار کے نمبر کی پلیٹ بدل دو اور ہاں اس کے اوپر دوسرا پائش تو ہو ہی گیا ہوگا۔“

”جی ہاں..... ہرے رنگ کا پائش کر دیا ہے۔“

”بہت خوب.....! نوکروں سے تو مدد نہیں لی تھی۔“

”آپ شاید مجھے نرا گھاڑی ہی سمجھتے ہیں۔“

”نرا تو نہیں..... البتہ کچھ ضرور سمجھتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”آؤ ذرا چل کر اسے دیکھ لیں۔“

فریدی اور حمید کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف آئے۔ حمید نے گیراج کا تالا کھولا۔ یہ

”مار ڈالا.....!“ حمید بوکھلا کر بولا۔ ”آج یقیناً پکڑیں جائیں گے۔ ارے اس کی کوئی تو کو توالی کے قریب ہی ہے۔“

”ہوگی.....!“ فریدی نے کہا۔ ”اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں..... ارے اس سے یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات گولی لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے، پکڑ کر بند کر دینے جانے کا احتمال رہتا ہے..... اور.....!“

”اچھا اچھا رہنے دیجئے..... آج میں اکیلے ہی جاؤں گا۔“

”خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے.....!“ حمید نے کہا۔

”اچھا تو کیا واقعی آپ اسے سچ سمجھتے..... بزخوردار اس پھیر میں نہ رہنا۔ تم تو کیا تمہاری کھیاں بھی چلیں گی۔“

”آپ شوق سے میری کھیموں کو اپنے ہمراہ لے جاسکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن مجھے معاف ہی کر دیجئے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”بہت اچھا..... دیکھا جائے گا۔“ فریدی نے جھنجھلا کر کہا اور آنکھیں بند کر کے آرام کرسی پر لیٹ گیا۔

حمید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ دفعتاً وہ مسکرانے لگا اس کے چہرے پر شرارت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

”میرے خیال سے تو آج بھی وہیں چلنا چاہئے جہاں کل گئے تھے۔“ حمید بولا۔

”یہ نیا خیال آپ کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا۔“ فریدی نے بدستور آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

”وہ جو وہاں سو رہی تھی کیا چیز تھی..... خدا کی قسم.....!“ حمید نے کہا۔

”اچھا جی.....!“ فریدی نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیوں..... کیا آپ کو پسند نہیں آئی۔“

”تو کیا میں وہاں اسی کو پسند کرنے گیا تھا۔“

گیراج ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کادھی جسے فریدی مخصوص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے بہت سے ملنے والوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ فریدی کے پاس دو کاریں ہیں۔ ملازمین میں سے صرف ڈرائیور کو اس کا علم تھا لیکن اسے بھی آج تک اس کار کو چلانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ شہر میں ہونے والی وارداتوں کے سلسلہ میں آج کل فریدی اور حمید اسی کار کو استعمال کر رہے تھے۔ روزانہ اس کے اوپر ایک تیارنگ پھیر دیا جاتا تھا۔ یہ خدمت حمید کے سپرد تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے التاسید حالیپ پوت کر رکھ دیا کرتا تھا۔

دونوں نے گیراج میں جا کر کار کا جائزہ لیا اور باہر نکل آئے۔

”ارے یہ اس وقت..... یہ محترمہ کہاں سے ٹپک پڑیں۔“ فریدی نے چھانک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حمید نے بھی پلٹ کر دیکھا، شہناز بیرونی چھانک سے اندر آ رہی تھی۔

”کیوں کیا آپ کو اس کا آنا گراں گزرتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں بھئی۔ اس وقت کی بات ہے، معلوم نہیں کتنی دیر تک بیٹھے، ساڑھے نو تو ہوئی

پچھے ہیں۔“ فریدی بولا۔

”خیر شکر ہے کہ آپ لوگ ملے تو.....!“ شہناز قریب آ کر بولی۔ ”میں کل بھی آئی تھی۔“

”کیا بتائیں آج کل ہم لوگ بہت بُری طرح مشغول رہتے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”چلو اندر چلو۔“

وہ تینوں ڈرائیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

”میں اس لئے آئی ہوں کہ آج سہاگ رات کا آخری دن ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ فریدی شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔

شہناز اپنے جملہ کی حماقت پر جھینپ گئی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ کل بلازا میں دوسری فلم لگ جائے گی۔“ شہناز جھینپے ہوئے انداز

میں بولی۔

”اوہ تو یہ کہو کہ تم آج فلم سہاگ رات دیکھنا چاہتی ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں.....!“

”تو جا کر دیکھ آؤ، اچھی فلم ہے۔“

”اکیلے دیکھ آؤں، کیا آپ لوگ نہ چلیں گے۔“

”نہیں بھائی..... ابھی دو تین دن تک ہم لوگ بہت زیادہ مشغول رہیں گے۔“ فریدی

نے کہا۔ ”اچھا میں ابھی آتا ہوں۔“

فریدی باہر چلا گیا۔

شہناز اس طرح منہ پھلائے بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ حمید سے روٹھی ہوئی ہو۔

”کیوں کیا بات ہے، کیا مجھ سے ناراض ہو۔“ حمید نے کہا۔

”میں کون ہوتی ہوں ناراض ہونو والی، بھلا اپنے محبتوں سے کوئی ناراض بھی ہوتا ہے۔“

”پھر وہی بات، آخر تم مجھے اتنا ستاتی کیوں ہو۔“

”یہ لیجئے..... یہ دوسری رسی، میں ہوتی کون ہوں ستانے والی۔“

”آخر میں نے کیا کیا ہے جو اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“

”میری باتیں اسی طرح بُری لگتی ہیں آپ کو، اچھا لیجئے چلی جاتی ہوں۔“

”ارے بھئی بیٹھو..... ارے میں نے کیا کہہ دیا جو اس طرح ناراض ہوتی ہو۔ ارے

ارے سنو تو سہی۔“

”نہیں صاحب..... میں واقعی بڑی بے حیا ہوں کہ خواہ مخواہ آپ کے پیچھے لگتی ہوں۔“

”خدا کے لئے بتاؤ تو سہی کہ میرا کیا قصور ہے۔ خواہ مخواہ اس طرح سے بگڑنے کی کیا

کرات ہے۔“

”میری تو ہر بات اسی طرح خواہ مخواہ کی ہوتی ہے۔“

”دیکھو میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

”نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں، میں انشاء اللہ کبھی آپ سے نہ ملوں گی۔“

”آخر کیوں.....؟“

”مجھے کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ آپ سے باتیں کر کے آپ کا سر پھوڑا ڈالوں۔“

”خدا کی قسم میں ہار گیا، لو بولتا ہوں..... گلڑوں کوں، گلڑوں کوں، گلڑوں کوں.....!“

”ارے ارے چپ رہے۔ فریدی صاحب کیا کہیں گے۔“ شہناز صراہا بولی۔

”نہیں صاحب..... میں تو بولوں گا..... گلڑوں کوں.....!“

”خدا کے لئے چپ رہے، یہ آپ کیا کرنے لگے۔“

”فریدی صاحب پوچھیں گے تو کہہ دوں گا کہ تم اس وقت مجھ سے صرف مرنے کی بولی

سننے کے لئے آئی تھیں..... گلڑوں کوں..... گلڑوں کوں.....!“

”خدا کے لئے چپ رہے..... یہ آپ کیا کرنے لگے۔“

”اچھا وعدہ کرو کہ اب ٹھٹھی ٹھٹھی باتیں کرو گی۔ ورنہ میں یونہی چیخے جاؤں گا۔“

”اچھا بابا..... میں ہار گئی لیکن یہ بتائیے کہ آپ دو تین دن سے آئے کیوں نہیں، آج

میرے ساتھ فلم دیکھنے کے لئے کیوں نہیں چلتے۔“

”ہاں یوں بات کرو، بات یہ ہے کہ آجکل ایک خاص مسئلہ درپیش ہے۔ شہر میں جو وردا تیں

ہو رہی ہیں انکے متعلق تو تم سن ہی چکی ہو گی، آج کل رات بھر ہم لوگوں کو گشت کرنا پڑتا ہے۔“

”واقعی یہ وارداتیں عجیب ہیں، سارے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ میں نے تو آج تک

اس قسم کی وارداتیں نہیں سنی، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈاکو گھروں میں کیوں گھستے پھرتے ہیں

جب کہ وہاں سے کوئی چیز لے نہیں جاتے۔“

”یہی تو حیرت کی بات ہے.....!“ حمید پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”اس معاملہ میں

فریدی صاحب جیسا مشاق جاسوس بھی حیران ہے۔“

”لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکوؤں کو کسی خاص چیز کی تلاش ہے۔“ شہناز بولی۔

”ہم لوگ بھی یہی سوچ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”اوپر یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ ڈاکو نہ تو کسی پر حملہ کرتے ہیں اور نہ اس سے ڈرنے

ہیں کہ کہیں وہ پکڑ نہ لئے جائیں، سینٹھ اگر وال کے یہاں جب وہ گھسے تھے تو بہت سے نوٹ

بانٹ کر چلے گئے، عجیب و غریب لوگ ہیں۔“

”لوگ انہیں برا بھلا تو ضرور کہتے ہوں گے۔“ حمید بولا۔

”نہیں یہ بات نہیں، لوگ تو ان کی دلیری کی تعریف کرتے ہیں۔“

یہ بھی عجیب بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر کبھی ہم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ہم بے

دریغ گولی چلا دیں گے۔“

”آخر یہ کیوں..... انہوں نے کسی کو کوئی نقصان تو پہنچایا نہیں۔“

”یہی کیا کم نقصان ہے کہ آج کل لوگ رات رات بھر سوتے نہیں۔“ فریدی نے کمرے

میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ شہناز نے فریدی سے پوچھا۔

”یہی کہ وہ لوگ پولیس کو اس چکر میں ڈال کر کوئی بڑی واردات کرنا چاہتے ہیں۔“

فریدی نے بتایا۔

”آپ کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے، بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے۔“ شہناز نے تائید کی۔

”واقعی مجھے افسوس ہے کہ ہم لوگ تمہارے ساتھ فلم دیکھنے نہ جا سکیں گے۔“ فریدی نے

قدرے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر پھر سہی لیکن تم آج جا کر سہاگ رات دیکھ آؤ۔“

جھاڑیوں میں

رات تاریک تھی۔ فضا میں سیاہیاں اڑ رہی تھیں۔ وقت کا دیوتا شاید اس وقت کرہ زمہریر

سے دنیا کی طرف جھانک رہا تھا۔ سردی ہڈیوں میں گھستی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس وقت

سونے والوں کے خواب تک منجمد ہو کر رہ گئے ہوں گے۔

”کیا بات ہے.....!“ لاری سے کسی نے اونچی آواز میں پوچھا۔
 دو تین آدمی دوڑ کر لاری کے قریب گئے اور کچھ کہتے رہے۔
 لاری سے آٹھ دس سپاہی اور ایک سب انسپکٹر اتر پڑے۔
 سب انسپکٹر پھاٹک میں کھڑے ہو کر سپاہیوں سے بولا۔ ”وہ دیکھو وہاں کار کیسی کھڑی
 ہے..... کیا یہ سیٹھ صاحب کی تو نہیں۔“
 ”جی نہیں سرکار..... ہماری سب گاڑیاں گیراج میں ہیں۔“
 انسپکٹر نے نارچ کی روشنی میں کار کا جائزہ لینا شروع کیا۔
 ”مگر یہ تو ہرے رنگ کی ہے۔ ڈاکوؤں کی کار تو سیاہ رنگ کی سنی جاتی ہے۔ رحیم خان تم
 ذرا جا کر اس کا نمبر تو دیکھو۔“
 ”یہ جگدیش معلوم ہوتا ہے، بُرے پھنے۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔
 ”خاموش رہو.....!“ فریدی بولا۔
 جگدیش کتے کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔
 ”ابھی ابھی کسی نے اس پر گولی چلائی ہے۔“ جگدیش نے پاس کھڑے ہوئے آدمیوں کی
 طرف مڑ کر کہا۔ ”تجربہ ہے کہ تم لوگوں نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔“
 ”نہیں سرکار.....!“ چوکیدار بولا۔ ”میں یہیں برآمدے میں بیٹھا جاگ رہا تھا میں نے
 اس کے غرانے کی آواز سنی تھی لیکن گولی کی آواز مجھے نہیں سنائی دی۔“
 ”داروغہ جی..... گاڑی کا نمبر وہ معلوم نہیں ہوتا.....!“ اس آدمی نے لوٹ کر کہا جو
 کار کا نمبر دیکھنے گیا تھا۔
 جگدیش نے کانشیلوں کو باغ کے اندر بلا لیا۔
 ”ضرور کوئی نہ کوئی یہیں چھپا ہوا ہے۔ آؤ تلاش کریں اور تم رحیم خاں جا کر اس کار کی
 گرائی کرو۔“
 ”یہ بہت بُرا ہوا.....!“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”اچھا آؤ..... اب چہار دیواری کو

گھنٹہ گھرنے دو بجائے اور سیٹھ کرم چند کے پائیں باغ کے پھاٹک کے سامنے ایک
 چھوٹی سی ہرے رنگ کی کار آ کر رکی۔ فریدی اور حمید سیاہ رنگ کے کپڑوں میں لمبوس نقابوں
 سے اپنے چہرے چھپائے اتر کر پھاٹک کے اندر داخل ہوئے۔ دختا غراہٹ کی آواز سنائی دی
 اور ایک بڑا سا کتا ان پر جھپٹ پڑا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ فریدی کے سائیلنسر لگے ہوئے پستول
 کی دو گولیوں نے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ کتے کی غراہٹ کی وجہ سے شاید کوشی کا
 چوکیدار اونگھتے اونگھتے چوٹک پڑا تھا۔
 ”ٹائیگر، ٹائیگر.....!“ اس نے کتے کو آواز دی۔
 بھونکنے کی آواز نہ پا کر وہ کھانتا کھنکھارتا پھاٹک کی طرف بڑھا۔
 ”میرے خیال سے اب بھاگنا چاہئے۔“ حمید نے چپکے سے کہا۔
 ”ہشٹ..... میرے پیچھے آؤ۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور ماتھی کی گھٹی جھاڑیوں میں
 چھپ گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔
 چوکیدار نے نارچ روشن کی اور ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔
 ”ارے یہ ٹائیگر کو کیا ہو گیا۔“ وہ خود ہی بڑبڑایا۔ ”ارے خون! اسے کس نے مارا۔“ اب
 وہ شاید کوشی کے ملازموں کے نام لے لے کر چیخ رہا تھا۔ پھر وہ چیخا ہوا کوشی کی طرف بھاگا۔
 ”اب بھی غنیمت ہے کہ نکل چلے، ورنہ بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“ حمید نے
 آہستہ سے کہا۔
 ”یہی تو بہترین موقع ہے گھر میں داخل ہونے کا۔“ فریدی نے کہا۔
 ”آج شاید پکڑے ہی جائیں گے۔“ حمید بولا۔
 ”بکومت.....!“
 اتنے میں تاریک برآمدے کے سارے بلب روشن ہو گئے اور باغ میں کافی اجالا ہو گیا۔
 کچھ لوگ دوڑ کر پھاٹک کے قریب آئے اور کتے کی لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اب ایک اچھا
 خاصا شور و غل شروع ہو گیا تھا۔ دختا گشتی پولیس کی لاری پھاٹک کے سامنے آ کر رکی۔

پھلانگتا کوئی مشکل کام نہیں۔ قبل اس کے کہ رحیم خان کارٹک پہنچے ہمیں اس پر پہنچ جانا چاہئے۔“
چار دیواری مالتی کی باڑ سے بالکل ملی ہوئی تھی اور جھاڑیوں سے نیچی تھی۔ اس لئے وہ دونوں بغیر کسی کی نظر پڑے ہوئے باہر نکل گئے۔

رحیم خاں کار کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ فریدی کا زور دار گھونہ اس کی بائیں کٹیٹی پر پڑا۔ رحیم خاں کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر سڑک کے کنارے جاگرا۔ دوسرے لمحہ میں کار اشارت ہو چکی تھی۔ جلدیش وغیرہ رحیم خاں کی چیخ سن کر چونکے ہی تھے کہ کار اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب شور مچاتے ہوئے دوڑے مگر کار اتنی دیر میں سینکڑوں گز آگے جا چکی تھی۔

”چلو چلو..... جلدی لاری میں بیٹھو۔“ جلدیش چیختا ہوا لاری کی طرف جھپٹا۔ بدحواسی میں لوگوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کا ایک ساتھی سڑک کے کنارے بیہوش پڑا ہے۔ پولیس کی لاری کار کا تعاقب کر رہی تھی۔

”دیکھا آپ نے..... میں نہ کہتا تھا۔“ حمید نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”تم تو اچھے خاصے چند ہو، یہ نہیں دیکھتے کہ مزہ کتنا آیا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”گھبرائیے نہیں، ابھی اور آئے گا مزہ..... آج خدای عزت رکھے تو معلوم ہو، پولیس کی لاری برابر پیچھا کئے جا رہی ہے۔“

”ڈرو نہیں بیٹا..... وہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکیں گے.....!“ فریدی نے کہا۔

”دیکھتے نہیں کہ وہ ہم سے کسی قدر پیچھے ہیں۔ بس تم رفتار بڑھاتے رہو۔“

”اور جو ایکسیڈنٹ ہو جائے تو۔“ حمید نے کہا۔

”اس کی پروا ہم تم مت کرو۔ اس وقت ایکسیڈنٹ کا کوئی امکان نہیں اور پھر ہم تو جنگل کی

طرف جا رہے ہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ اسی طرح اندھا دھند بھاگتے رہیں گے اور وہ لوگ

ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے۔ جب ہماری گاڑی کا پٹرول ختم ہو جائے گا تو ہم دھرتے جائیں

گے۔“ حمید نے کہا۔

”کون جانے انہیں کی لاری کا پٹرول پہلے ختم ہو جائے۔“ فریدی نے کہا۔

”اگر آپ اسی بھروسہ پر بیٹھے ہیں تب تو ہو چکا۔“ حمید کی آواز میں بیزاری سی تھی۔

”اچھا ٹھہرو! میں اس لوڈے کو بیوقوف بنانا ہوں۔ اگلے موڑ پر کار آہستہ کر دینا میں اترا جاؤں گا اور پھر تم تیزی سے آگے بڑھ جانا۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”میں پولیس کی لاری روک کر تمہیں نکل جانے کا موقع دوں گا۔ راستہ تو تم نے دیکھا ہی

ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

حمید خاموش رہا۔

”رفقار دھیمی کرو.....!“ فریدی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”لاری نظر نہیں

آ رہی ہے جلدی کرو۔“

حمید نے کار کی رفتار دھیمی کر دی۔

فریدی آہستہ سے اتر گیا اور کار پھر فرارٹے بھرنے لگی۔ فریدی سڑک کے کنارے اونچی اونچی جھاڑیوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی پولیس کی لاری دکھائی دی اس نے اپنے ہاتھوں سے اسی طرف فائر کرنے شروع کر دیئے جدھر حمید کی کار گئی تھی۔

جلدیش نے فائروں کی آواز سن لاری روکوا دی۔ فریدی بدستور فائر کئے جا رہا تھا۔ پولیس

والے اس کی طرف دوڑے، دفعتاً کسی نے جھاڑیوں کے پیچھے سے فریدی کو اندر کھینچ لیا۔ فریدی

جھاڑیوں میں الجھ کر گر پڑا، ساتھ ہی دو تین آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔

”جلدیش جلدیش.....!“ فریدی چیخا۔ ”دوڑو..... ورنہ یہ۔“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی

نے اس کا منہ دبا لیا۔

پولیس والے جھاڑیوں کے اندر گھس پڑے۔ جھاڑیوں میں عجیب قسم کا خلفشار برپا تھا۔

ٹھوڑی دیر میں ریوالوروں کی چنگاریاں جھکنے لگیں۔

”بھئی اب اس کا تذکرہ مت کرو۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم میں سے کسی سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ گولی چلا کر لاری کا ایک آدھ ٹائر ہی برسٹ کر دیتا۔“ جگدیش نے کہا۔

حیرت

دوسرے دن صبح کو تو اہلی میں ایس پی کے کمرے میں چیف انسپکٹری آئی ڈی، سارجنٹ حمید، ایس پی اور انسپکٹر جگدیش بیٹھے تبادلہ خیال کر رہے تھے، میز پر وہی رات والی خون آلود فلٹ ہیٹ رکھی ہوئی تھی۔

”حمید تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ فلٹ ہیٹ فریدی کی ہے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔
”ارے صاحب! مجھ سے زیادہ اسے کون پہچانے گا۔ دیکھئے اس کے اندر جو سانپ کا سر بنا ہوا ہے یہ فریدی صاحب نے میرے ہی سامنے فاؤنٹین پن سے بنایا تھا۔“

”آ خر انہوں نے یہ بنایا ہی کیوں تھا۔“ ایس۔ پی بولا۔
”یونہی بیٹھے باتیں کر رہے تھے فاؤنٹین پن ہاتھ میں تھا۔ ٹوپی گود میں رکھی تھی، باتیں کرتے جاتے تھے اور تصویر بناتے جاتے تھے۔“

”کیا بتاؤں.....!“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میں نے سینکڑوں بار سمجھایا کہ خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو، مگر اسے تو جیسے خط ہو گیا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا، معلوم نہیں کیا حشر ہو۔“

”ارے صاحب کیا بتاؤں ساری غلطی میری اپنی ہے۔ نہ میں ان سے دوستانہ طور پر مدد کا طالب ہوتا اور نہ وہ اس مصیبت میں جتلا ہوتے۔“ جگدیش نے گلوگیر آواز میں کہا۔
حمید کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔
”اور صاحب ایسے ڈاکو تو آج تک میری نظروں سے نہیں گزرے۔“ ایس پی بولا۔

پولیس پارٹی نے بھی فائروں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد مخالف سمت سے فائر ہونے بند ہو گئے۔ اب پولیس والے آہستہ آہستہ آگے کی طرف ریک رہے تھے۔

”دھننا موٹر اشارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پولیس والے اٹھ کر سڑک کی طرف بھاگے۔ پولیس کی لاری اندھیری سڑک پر روشنی بکھیرتی ہوئی آگے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔“
”لو یہ نئی مصیبت آئی۔“ جگدیش جھلا کر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”کجنت بڑی زبردست چوٹ دے گئے۔ اب تم سب لوگ اپنی اپنی نوکریوں کو روپیٹ لو..... لاری گئی۔“

”تو سرکار اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ کسی ایک کی ڈیوٹی موٹر پر لگادی ہوئی۔“ ایک کانسٹیبل نے کہا۔

”ہاں ہاں اب مجھی پر تو سارا الزام آئے گا۔“ جگدیش نے کہا۔ ”مگر آ خر فریدی صاحب کیا ہو گئے۔ میں نے ان کی آواز صاف پہچانی تھی، آؤ انہیں تلاش کریں۔“
”اور صاحب لاری کا کیا ہوگا۔“ ایک کانسٹیبل بولا۔

”ہوگا کیا..... اور اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ تن بہ تقدیر بیٹھو، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“
وہ سب دوبارہ ٹارچوں کی روشنی میں جھاڑیوں میں گھس پڑے۔ قرب و جوار کا چپہ چپہ چھان مارا مگر کسی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جہاں فریدی کھڑا تھا وہاں انہیں ایک فلٹ ہیٹ زمین پر پڑی ہوئی ملی جس پر تازہ خون کے دھبے تھے۔ جگدیش الٹ پلٹ غور سے دیکھنے لگا۔

”چلو یہ ایک کام کی چیز ملی..... شاید اسی سے کوئی سراغ ملے۔“ جگدیش نے کہا۔ ”مگر بڑی حیرت کی بات ہے کہ آ خر فریدی صاحب کیا ہو گئے۔ میں نے انکی صاف آواز پہچانی تھی۔“
”حضور آپ کو دھوکا ہوا ہوگا.....!“ ایک کانسٹیبل بولا۔

”ناممکن..... میرے کان مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکو انہیں پکڑ لے گئے، معلوم نہیں بے چارے پر کیا افتاد پڑی۔“

”ہوگا سرکار..... مجھے تو لاری کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔“ ایک کانسٹیبل نے کہا۔

”ابھی تک بیوا سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ وہ لاری بھی یہاں چھوڑ گئے، بلا کے دلیر واقع ہوئے ہیں۔“

”اسی چیز نے تو فریدی کو نچلا نہ بیٹھنے دیا، بھلا اس سے اتنا صبر کہاں ہو سکتا تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر یہ کیس اپنے ہاتھ میں آنے کا انتظار کرتا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”کچھ بھی ہو، مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے.....!“ ایس پی بولا۔ ”وہ سارے صوبہ میں تو کیا تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو یہ سارے ہندوستان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔“

”اب میں کیا بتاؤں۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میرا تو داہنا بازو ٹوٹ گیا۔ یقین مانئے مجھے سچ بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ میرے حکم کا بھرم اسی کے دم سے قائم تھا۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ ایس پی بولا۔ ”اچھا صاحب تو یہ کیس اب میں آپ کے حکم کے سپرد کرتا ہوں اب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں رہا۔“

”خیر اب میں چلوں گا، اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں۔“ چیف انسپکٹر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کیس کے سارے کاغذات سارجنٹ حمید کے حوالے کر دیجئے۔ بہت جلد تفتیش شروع کرادوں گا۔ یا بہت ممکن ہے کہ خود میں اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ کیونکہ فریدی کا اس طرح غائب ہو جانا میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔“

چیف انسپکٹر کے چلے جانے کے بعد حمید نے کاغذات لئے اور دفتر جانے کی بجائے سیدھا گھر آیا۔ سب سے پہلے اسے وہ کام انجام دینا تھا جس کے لئے اتنی دردمندی مولی گئی تھی۔ سو روپے کا نوٹ انہی کاغذات میں تھی تھا اس نے وہ نوٹ نکال کر اس کی جگہ دوسرا نوٹ نتھی کر دیا۔ لیکن اب زحمت یہ آپڑی تھی کہ نوٹ کا وہ نمبر کس طرح مٹایا جائے جو جگدیش نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس طرح چونکا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ اٹھا اور فریدی کے عجائبات کے کمرے سے ایک شیشی نکال لایا، جس میں سفید رنگ کی کوئی سیال شے تھی۔ یہ ایک سیاسی اڑانے کا نادر و نایاب لوٹن تھا، جسے فریدی نے ایک

نیپالی سیاح سے بنوایا تھا۔ لوٹن لگاتے ہی نوٹ کا نمبر کاغذ سے اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہاں کبھی کچھ لکھا ہی نہ گیا تھا۔ کاغذ خشک ہو جانے کے بعد حمید نے اسی جگہ اپنے لگے ہوئے نوٹ کے نمبر لکھ دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ آنکھیں بند کر کے آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ بالکل منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے، پتہ نہیں وہ لوگ فریدی کو پکڑ لے گئے یا انہوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ فلت ہیٹ پر خون کے دھبے کوئی اچھا ٹگن نہیں۔ کبھی وہ سوچتا ممکن ہے کہ فریدی مصلحتاً غائب ہو گیا ہو۔ اس سے قبل بھی وہ کئی بار غائب ہو چکا تھا۔ مگر اس بار تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ آخر یہ لوگوں کے گھروں میں گھستے پھرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ کوئی چیز ہے جسے فریدی سینٹھ اگر وال کی تجوری سے نکال کر لایا تھا۔ یقیناً وہ چیز انتہائی حیرت انگیز ہوگی جس کی چوری پر اس کا مالک بھی منہ نہیں کھول سکتا۔ عجیب قسم کا گورکھ دھندا تھا۔ آخر سینٹھ اگر وال نے پولیس کو دھوکے میں کیوں رکھا ہے۔ جبکہ حقیقتاً کوئی چیز اس کی تجوری سے چرائی گئی ہے لیکن وہ پولیس کو بتاتا کیوں نہیں۔“

آفس کا وقت ہو گیا تھا۔ حمید نے کھانا کھا کر کپڑے بدلے اور کاغذات جب میں رکھ کر آفس جانے کے لئے باہر نکلا۔ فریدی کی بڑی کارکنی دن سے خراب تھی۔ اس لئے آج کل بس پر بیٹھ کر آفس جانا پڑتا تھا۔ وہ چوراہے تک پیدل آیا اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد بس آئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ بس میں بھیڑ بہت زیادہ تھی اس لئے اسے کھڑے رہنا پڑا۔

آفس پہنچ کر وہ سیدھا چیف انسپکٹر کے کمرے میں گیا۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ حمید کو دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کر کے پھر لکھنے لگا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے۔“ چیف انسپکٹر قلم رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”کیا عرض کروں.....!“ حمید نے کہا۔

”کیا تم اس سے پہلے سے واقف تھے کہ فریدی جگدیش کے کہنے پر اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”جی نہیں..... میرے خیال سے تو انہوں نے اسے ٹالنے کے کچھ یونہی سے جملے کہ دیئے تھے۔“

مگر جگدیش تو کہتا ہے کہ فریدی نے اسے موقع وارزوات پر آواز دی تھی۔
”ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں۔“

”اچھا وہ کاغذات لائے ہو۔“

”جی ہاں.....!“ حید نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک ایک اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے وہ اپنی ساری جیبوں کی تلاش لے رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

”کیوں کیا بات ہے۔“ چیف انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

”مم..... مم..... معلوم ہوتا ہے ککہ..... کسی نے جیب سے نکال لیا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”جی ہاں! میں نے اسی جیب میں رکھے تھے۔“

”کمال کیا تم نے..... یہ جب کبھی اس طرح کے کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس میں تو کوئی بچ بھی چیز نہایت آسانی سے نکال سکتا ہے۔“

”جی کیا بتاؤں..... مگر..... مگر.....“

”اب مگر کیا کر رہے ہو۔ جاؤ تلاش کرو.....!“ چیف انسپکٹر تیز لہجہ میں بولا۔

حید بوکھلا کر کمرے سے نکل آیا۔

وہ تیزی سے روڈ پر بس کے انگلے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ راہ میں اس نے ایک عیسائی اور بس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوراہے کے پاس سے اس بس کی تمام

تفصیلات پوچھیں اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ تھوڑے دیر میں اس نے بس کو جا لیا۔ بس قریب قریب خالی ہو چکی تھی صرف دو چار مسافر رہ گئے تھے۔ حید سیٹوں کے نیچے کاغذات تلاش کرنے لگا۔

”آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔“ بس کنڈیکٹر نے پوچھا۔

”بھی میری جیب میں کچھ کاغذات تھے جو غالباً اسی بس میں نکل گئے۔“
”کیا کوئی لفاظ تھا۔“

”جی ہاں..... سرخ رنگ کا بڑا لفاظ۔“

”یہ لہجے.....!“ بس کنڈیکٹر نے اپنے چہرے کے تھیلے سے ایک لفاظ نکالتے ہوئے

”ایک صاحب نے مجھے دیا تھا۔“

حید نے سب سے پہلے کاغذات نکال کر دیکھے پھر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب بات موجود ہیں، اس نے بس کنڈیکٹر سے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا جس نے اسے دیا تھا۔

”اس کی شکل صورت تو مجھے یاد نہیں البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کسی اچھی سوسائٹی کا آدمی تھا۔“

”اس نے کیا کہا کہ یہ لفاظ آپ کو دیا تھا۔“

”یہی کہ شاید کسی کا کر گیا ہے، آپ اسے احتیاطاً اپنے پاس رکھئے!“ کنڈیکٹر نے کہا۔

خونخاک دھماکے

کاغذات لے کر آفس کی طرف لوٹنے ہوئے حید سوچ رہا تھا کہ وہ چیف انسپکٹر سے

کہ وہ دراصل کاغذات گھر بھول آیا تھا۔ لیکن ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ

اس کی طرف ریگنے لگا۔ نہیں وہ چیف انسپکٹر کو ٹھیک ٹھیک بتا دے گا کہ اسے یہ کاغذات بس

کنڈیکٹر سے ملے اسی طرح وہ دوسرا نوٹ لگانے اور نمبروں کے غلط اندراج کے الزام سے بچ

سکا۔ بہت ممکن ہے کہ کبھی یہ راز کھل ہی جائے تو وہ نہایت آسانی سے کہہ سکے گا کہ کسی نے

کاغذات اسی لئے اس کی جیب سے نکالے تھے کہ نوٹ بدل دیا جائے، اس نئے خیال پر اس

کمال بہت کچھ دور ہو گیا۔

حمید نے جوتے کو ایک اخبار کے ٹکڑے میں لپیٹ کر کار میں رکھ دیا۔
 ”میرے خیال سے تو یہاں کسی قسم کا سراغ ملنا مشکل ہی ہے۔“ حمید نے کہا۔
 ”تو پھر اب کیا کیا جائے۔“ جگدیش بولا۔

”سینٹھ اگر وال اور وہ دوسرے لوگ جن کے یہاں وارداتیں ہو چکی ہیں ان سے ملنا
 “چیف انسپکٹر نے کہا۔

”بات ہی ایسی ہے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میرے خیال سے تو چلو پہلے موقعہ وارداتیں
 تک ہو آئیں اس کے بعد سینٹھ اگر وال کے یہاں چلیں گے۔“
 ”بہتر ہے۔۔۔۔۔!“

چیف انسپکٹر نے جگدیش کو فون کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ چندرہ میں منٹ بعد جگدیش
 پہنچ گیا اور پھر تینوں موقعہ واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔
 ”جی ہاں، کار رکوائیے۔۔۔۔۔ بس یہی وہ مقام ہے۔“ جگدیش نے کہا۔

کار کی اور تینوں جھاڑیوں کے قریب اتر پڑے، چیف انسپکٹر بہت غور سے زمین
 ایک ایک حصہ کا جائزہ لے رہا تھا۔
 ”ارے یہ جوتا کیسا۔۔۔۔۔!“ چیف انسپکٹر نے جھاڑیوں میں سے ایک جوتا نکالتے ہوئے
 کہا۔ حمید چونک پڑا۔

”یہ بھی فریدی صاحب کا ہے۔“ حمید نے بے ساختہ کہا۔
 ”عجیب معاملہ ہے۔ اس پر بھی خون کے دھبے ہیں، خدا خیر کرے۔“ چیف انسپکٹر
 پریشانی کے لہجہ میں کہا۔

”صاحب میرا خیال تو ہے کہ شاید وہ مصلحتاً غائب ہو گئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔
 ”جب وہ کوئی زیادہ خطرناک کام کرتے ہیں تو اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں، حد تو
 ہے کہ مجھے بھی اس کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے آپ کی تجوری کنجی سے کھولی تھی۔“
 ”اب اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“
 ”بہت ممکن ہے۔“ حمید نے چیف انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ڈاکوؤں نے کوئی ایسی
 ”جو جس کا اظہار خود سینٹھ صاحب کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میں اسے اپنے بیٹوں کی طرح عزت
 رکھتا ہوں۔“

آفس پہنچ کر اس نے کاغذات چیف انسپکٹر کے حوالہ کر دیئے اور خود اپنی میز پر آ بیٹھا۔
 تھوڑی دیر بعد چیف انسپکٹر کے کمرے میں اس کی طلبی ہوئی۔

”کہو بھئی۔۔۔۔۔ پھر تم نے اب کیا سوچا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔
 ”کیا عرض کروں، میری تو عقل ہی جواب دے چکی ہے۔“

”بات ہی ایسی ہے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میرے خیال سے تو چلو پہلے موقعہ وارداتیں
 تک ہو آئیں اس کے بعد سینٹھ اگر وال کے یہاں چلیں گے۔“
 ”بہتر ہے۔۔۔۔۔!“

چیف انسپکٹر نے جگدیش کو فون کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ چندرہ میں منٹ بعد جگدیش
 پہنچ گیا اور پھر تینوں موقعہ واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔
 ”جی ہاں، کار رکوائیے۔۔۔۔۔ بس یہی وہ مقام ہے۔“ جگدیش نے کہا۔

کار کی اور تینوں جھاڑیوں کے قریب اتر پڑے، چیف انسپکٹر بہت غور سے زمین
 ایک ایک حصہ کا جائزہ لے رہا تھا۔
 ”ارے یہ جوتا کیسا۔۔۔۔۔!“ چیف انسپکٹر نے جھاڑیوں میں سے ایک جوتا نکالتے ہوئے
 کہا۔ حمید چونک پڑا۔

”یہ بھی فریدی صاحب کا ہے۔“ حمید نے بے ساختہ کہا۔
 ”عجیب معاملہ ہے۔ اس پر بھی خون کے دھبے ہیں، خدا خیر کرے۔“ چیف انسپکٹر
 پریشانی کے لہجہ میں کہا۔

”صاحب میرا خیال تو ہے کہ شاید وہ مصلحتاً غائب ہو گئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔
 ”جب وہ کوئی زیادہ خطرناک کام کرتے ہیں تو اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں، حد تو
 ہے کہ مجھے بھی اس کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے آپ کی تجوری کنجی سے کھولی تھی۔“
 ”اب اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“
 ”بہت ممکن ہے۔“ حمید نے چیف انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ڈاکوؤں نے کوئی ایسی
 ”جو جس کا اظہار خود سینٹھ صاحب کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میں اسے اپنے بیٹوں کی طرح عزت
 رکھتا ہوں۔“

اگر وال اس جملہ پر بوکھلا گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے چہرے کی ساری رونق بھی نہیں۔ حمید ایک لمحہ تک کھڑا سوچتا رہا پھر جیب سے دیا سلائی نکال کر ایب تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں برآمدے میں داخل ہوا۔

چھین لی ہو۔

”یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔“ سیٹھ اگر وال نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا شہر میں جتنی وارداتیں ہوئی ہیں سب اسی قسم کی ہیں۔ شہر میں اور لوگ بھی تو ایسے ہی ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی جلا دی، وہ حیرت سے ہیں جن کے ہاں ڈاکو گھسے، تجوریاں کھولیں اور جوں کی توں کھلی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ ان کے یہاں سے کوئی چیز چوری ہو گئی ہے۔“

”یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ چیف نے کہا۔

حمید دل ہی دل میں فریدی کی ذہانت کی داد دینے لگا۔

”شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے وہ گھر واپس آیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، اسے یہ دیکھ کر کھلائی، تجوری کھلی ہوئی نظر آئی۔ دیا سلائی پھینک کر اس نے جلدی سے بجلی جلائی اور تجوری پر نوکروں پر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے ابھی تک برآمدے کی بجلی نہیں جلائی تھی۔ وہ جھلاتا ہوا ہنک پڑا۔ اس کی دانست میں جتنی چیزیں پہلے تھیں اتنی ہی اب بھی موجود تھیں۔ وہ پریشانی میں برآمدے میں داخل ہوا۔ پہلا ہی پیر اندر رکھا تھا کہ دھماکے کی آواز سنائی دی، حمید اچھل کر ایک پانا تھا رگڑنے لگا۔ دفعتاً اسے نوٹوں کے بیٹل پر ایک کاغذ رکھا ہوا نظر آیا۔ اسے اچھی طرح طرف ہو گیا۔ دوسرا پیر زمین پر پڑا تھا کہ بیک وقت دو دھماکے سنائی دیئے۔ حمید پھر اچھلا۔ رکھا کہ جب صبح اس نے سرکاری کاغذات والا نوٹ بدلنے کے لئے تجوری کھولی تھی اس وقت پھر دھماکہ ہوا..... جیسے جیسے وہ برآمدے میں اچھلتا پھر رہا تھا دھماکوں کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی، کاغذ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے کاغذ اٹھا لیا اس پر انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تحریر تھی۔

سارے نوکر بھاگ کر ادھر ہی چلے آئے تھے اور سب حیرت سے اسے اچھلتا ہوا دیکھ رہے تھے

ہر دھماکے کے ساتھ حمید کے پیروں سے چنگاریاں نکلتی معلوم ہوتی تھیں، آخر کار وہ بوکھلا کر برآمدے کے نیچے کود آیا۔ سارے نوکر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

”اے گدھو..... تم نے برآمدے کی بجلی کیوں نہیں جلائی۔“ وہ گرج کر بولا۔

”سرکار..... ابھی ابھی یہاں روشنی کر کے گیا ہوں!“ ایک نوکر نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔

”اچھا چلو جا کر بجلی جلاؤ۔“ حمید نے کہا۔

حمید نے اس کاغذ کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور تجوری کا ڈھکن بند کر کے تیزی

وہ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں گیا وہ سوچ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے پیروں سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ برآمدے ہی میں تھا کہ سڑک پر ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر پھاٹک پر آیا، کار مغرب کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی۔

سارے نوکر گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے، حمید چیخا ہی رہ گیا لیکن کسی نے پلٹ کر دیکھنا نہیں دیا۔ فریدی کی کار بھی بگڑی پڑی تھی، چھوٹی کار

”ارے.....!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ اس طرح چلنے لگا جیسے کسی چیز کو پچا

پا کر قدم رکھ رہا ہو، سوچ بورڈ نزدیک ہی تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی جلا دی، وہ حیرت سے برآمدے کے فرش کو گھور رہا تھا۔ فرش پر بے شمار چھوٹی چھوٹی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ حمید نے ایک گولی پر پیر رکھ دیا۔ پیر رکھتے ہی پھر دھماکہ ہوا۔ دفعتاً ایک خیال سرعت سے اس کے ذہن کے گوشوں سے ٹکرایا، وہ دوڑتا ہوا اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں تجوری رکھی ہوئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دیا سلائی کھلائی، تجوری کھلی ہوئی نظر آئی۔ دیا سلائی پھینک کر اس نے جلدی سے بجلی جلائی اور تجوری پر نوکروں پر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے ابھی تک برآمدے کی بجلی نہیں جلائی تھی۔ وہ جھلاتا ہوا ہنک پڑا۔ اس کی دانست میں جتنی چیزیں پہلے تھیں اتنی ہی اب بھی موجود تھیں۔ وہ پریشانی میں برآمدے میں داخل ہوا۔ پہلا ہی پیر اندر رکھا تھا کہ دھماکے کی آواز سنائی دی، حمید اچھل کر ایک پانا تھا رگڑنے لگا۔ دفعتاً اسے نوٹوں کے بیٹل پر ایک کاغذ رکھا ہوا نظر آیا۔ اسے اچھی طرح طرف ہو گیا۔ دوسرا پیر زمین پر پڑا تھا کہ بیک وقت دو دھماکے سنائی دیئے۔ حمید پھر اچھلا۔ رکھا کہ جب صبح اس نے سرکاری کاغذات والا نوٹ بدلنے کے لئے تجوری کھولی تھی اس وقت پھر دھماکہ ہوا..... جیسے جیسے وہ برآمدے میں اچھلتا پھر رہا تھا دھماکوں کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی، کاغذ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے کاغذ اٹھا لیا اس پر انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تحریر تھی۔

”جاسوس کے بچے

تیرے استاد نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ اس وقت وہ میری قید میں ہے۔ جو چیز وہ

بچہ اگر وال کے یہاں سے اڑا کر لایا تھا میں لئے جا رہا ہوں۔ اگر تم اپنے خیریت چاہتے ہو تو

مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا۔

میرے پیچھے لگنے کی سزا موت ہے۔“

حمید نے اس کاغذ کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور تجوری کا ڈھکن بند کر کے تیزی

وہ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں گیا وہ سوچ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے پیروں سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ برآمدے ہی میں تھا کہ سڑک پر ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر پھاٹک پر آیا، کار مغرب کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی۔

سارے نوکر گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے، حمید چیخا ہی رہ گیا لیکن کسی نے پلٹ کر دیکھنا نہیں دیا۔ فریدی کی کار بھی بگڑی پڑی تھی، چھوٹی کار

نکلنے کی ہمت نہ پڑی کیونکہ اس پر ابھی تک ہر اسی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آخر بوکھلاہٹ میں اس نے اسی طرف دوڑنا شروع کر دیا جدھر وہ کارنگی تھی۔ خوش قسمتی سے تھوڑی ہی دور پر ایک خالی ٹیکسی کھڑی ہوئی مل گئی۔ حمید دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔

”کہاں چلے گا.....!“ ڈرائیور نے کہا۔

”ادھر کوئی چاکلیٹی رنگ کی کارنگی ہے۔“

”جی ہاں ابھی ابھی گزری ہے۔“

”اس کا پیچھا کرو۔“

ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر ٹیکسی اشارت کر دی۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک چاکلیٹی رنگ کی کار دکھائی دی۔ اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ حمید نے بھی ٹیکسی کی رفتار فاصلہ کی مناسبت سے کم کر دی۔ کار اچانک ایک گلی میں گھوم گئی۔ حمید کی ٹیکسی جیسے ہی گلی کے سامنے پہنچی اس نے چاکلیٹی رنگ کی کار سے ایک عجیب اٹلقت آدمی کو اترتے دیکھا۔ حمید نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کو روک لیا اور کرایہ دے کر اتر پڑا۔ گلی میں میونسپلٹی کی لائٹنیوں کی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی اور اس میں سے اترنے والا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آگے کی طرف جا رہا تھا۔ حمید چھپتا چھپاتا اس کا تعاقب کر رہا تھا اور ابھی مشکل سے سات بجے ہوں گے لیکن گلی بالکل سنسان تھی۔ کار سے اترنے والا پُرجیچ گلیوں سے گذرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ پھر دوسری شاہراہ پر آ گیا، یہاں بجلی کے تقموں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب حمید نے غور سے دیکھا، اتنی خوفناک شکل آج تک اس کی نظروں سے نہ گذری تھی۔

بھیانک چہرہ

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم میں سنسانہٹ دوڑ گئی ہو۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں پڑا ہوا تھا کہ خوفناک

آدمی ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ حمید شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر دفعتاً اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگا۔ یہ کیا حماقت ہے۔ آخر خوف کی کیا وجہ ہے اور پھر اس کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ کسی وقت بھی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ حمید بھی ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ شراب اور تمباکو کے دھوئیں کی ملی جلی بو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں زیادہ تر متوسط طبقہ کے اوباش لوگوں کا مجمع نظر آیا کرتا تھا شہر کے بدنام ہوٹلوں میں سے یہ بھی ایک تھا۔ یہاں آئے دن نئی نئی وارداتیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم نہ تھا جسے پولیس نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

بات دراصل یہ تھی کہ اس کا مالک سنتوش ایک ذی اثر آدمی تھا۔ آئے دن بڑے بڑے افسروں کی دعوتیں کیا کرتا تھا۔ اونچی سوسائٹی میں اسے کافی مقبولیت حاصل تھی۔ حمید ہوٹل کے اندر چلا تو گیا لیکن اسے یہ سوچ کر الجھن ہونے لگی کہ وہ یہاں کرے گا کیا۔ کیونکہ یہاں آنے والے زیادہ تر شرابی تھے۔ کوئی شریف آدمی مشکل ہی سے ادھر کا رخ کرتا تھا۔

حمید شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن اب تو آئی گیا تھا اور اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ بھیانک چہرے والا آدمی ٹھیک اس کے سامنے بیٹھے ہوا تھا۔ ایک بار اس کی اور حمید کی نظریں مل گئیں۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے برقی تار مس کر دیا ہو۔ اس کا چہرہ انتہائی خوفناک تھا۔ موٹی سی ناک درمیان میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ نتھنے کافی چوڑے تھے جن کے گرد گھنی مونچھیں بہت زیادہ ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں۔ مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ دہانہ صاف نہیں دکھائی دیتا تھا۔ سر پر بڑے بڑے گھنگھر یا لے بال تھے، گھنے ابروؤں کے نیچے انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں کسی تاریک قبرستان میں جلتے ہوئے چراغوں سے کم خوفناک نہ تھیں۔ سانس لیتے وقت اس کے نتھنے پھولتے پچکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ رخساروں پر کئی گہرے زخموں کے نشانات تھے۔ اس نے ہیرے کو آواز دے کر شراب منگوائی اور پوری بوتل اتنی جلدی ختم کر دی جیسے اس نے شراب کی بجائے پانی پیا ہو۔ اس نے شراب اتنے بھونڈے پن کے ساتھ پی تھی کہ ابھی تک اس کی تھوڑی سے قطرے ٹپک

رہے تھے۔ اس نے انتہائی لاپرواہی کے ساتھ ہاتھ سے منہ پونچھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر اپنا بھدرا سا پاپ سلگانے لگا۔ حمید سوچ رہا تھا۔

..... تو یہی حضرت تھے جنہوں نے فریدی کی تجوری کھولی تھی۔ انتہائی چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے برآمدے میں اس لئے چنانے ڈال دیئے تھے کہ آنے والوں کی آہٹ مل سکے۔ بلا کا مکار معلوم ہوتا ہے۔ اب حمید اسی فکر میں تھا کہ اس سے وہ چیز کس طرح حاصل کی جائے جو اس نے فریدی کی تجوری سے نکال لی تھی۔ لیکن صبح تو اسے تجوری میں کوئی چیز نہیں دکھائی دی تھی۔ پھر آخر اس نے اس میں سے کیا نکالا۔

دفعتاً حمید چونک پڑا۔ ایک بیرا نہایت خاموشی سے اس کی میز کے قریب آ گیا تھا۔
”بیر اور مٹن چا پ۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔ بیر اسے کوئی اناڑی پینے والا سمجھ کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک کشتی میں گولڈن ایگل کی ایک بوتل اور کچھ مٹن چا پ لے کر واپس آیا۔ ”صاحب اگر کاک ٹیل پیئیں تو لاؤں، ٹماٹر کی ہے، اور ابھی تیار ہوئی ہے۔“ بیر نے میز پر کشتی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”نہیں.....!“ حمید نے کہا اور بوتل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ بیر نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر کاک نکالی اور میز پر رکھ کر گلاس آگے سرکا دیا۔
”کچھ اور صاحب.....!“ اس نے جھک کر مودبانہ کہا۔

”نہیں.....!“ حمید نے کہا اور گلاس میں بیر اٹھیلنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نیک نکیوں سے اس خوفناک آدمی کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کئے کرسی پر نیم دراز تھا، حمید اپنا گلاس بھر کر اس میں ناپتے ہوئے بلبوں کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ مٹن چا پ کھانے لگا۔ گلاس جوں کا توں بھرا ہوا رکھا تھا۔ پینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بیر پھر ادھر سے گذرا۔
”اے بیرا..... مل لاؤ۔“ حمید نے اسے روک کر کہا۔

”کیوں صاحب کیا قصور ہوا۔“

”نہیں بھائی..... اس میں قصور کی کیا بات ہے۔“

”ابھی تو آپ کی سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا۔“

”بہت بہتر حضور۔“

بیر ابل لے کر واپس آیا۔ حمید نے پلیٹ میں کچھ نوٹ رکھ دیئے۔ بیر اسلام کر کے چلا گیا۔ حمید نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر منہ سے دھوئیں کے دائرے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

بھیانک چہرے والا ایک بیک چونک کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک خوش پوش آدمی کھڑا بار مین سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کی طرف چلا گیا۔ خوش پوش آدمی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے گرجدار آواز میں کہا..... ”بل.....!“

بار مین نے ایک بیرے کو آواز دی۔

”صاحب کا کتنا ہوا۔“ اس نے بیرے سے پوچھا۔

”سازھے بارہ.....!“ بیرے نے کہا۔

خوفناک چہرے والا دس دس کے دو نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کر واپس ہونے کے لئے مڑا۔

”صاحب بقیہ روپے تو لیتے بائیے۔“ بار مین بولا۔

”بقیہ تمہارا بخشش.....!“ خوفناک چہرے والے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابھی وہ ہوٹل کے باہر قدم نہ نکالنے پایا تھا کہ ایک قوی بیگل آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوفناک چہرے والے نے اسے اس طرح گھورا جیسے کچا کھا جائے گا۔ قوی بیگل آدمی مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج کی طرف جانے لگا۔ بھیا تک چہرے والا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ جا رہا تھا۔ حمید بھی اٹھ کر ان کے پیچھے چلا جب انہیں اندر داخل ہونے پانچ منٹ گذر گئے تو وہ بھی لڑکھڑاتا اور ہچکیاں لیتا ہوا لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے

ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ حمید نے ایک بھونڈا سا گانا گانا شروع کر دیا۔ قوی ہیکل آدمی نے آکر اس کی گردن دبوچ لی۔

”کیوں ہلچلتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہم گانا گاتی ہے بھائی، ہم تم کو بھی سنائے گی“ حمید نے ہنسی لی اور شرابی کا پارٹ ادا کرنا شروع کیا۔

”معلوم ہوتا ہے بہت چڑھ گئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کہاں پڑھ گئی ہے۔“ حمید نے نیچے سے اوپر تک اپنا جسم ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”واہ بیٹا.....!“ قوی ہیکل آدمی بے اختیار ہنس پڑا اور حمید بے سدھ ہو کر ایک صوفے پر گر گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بالکل بے ہوش ہو گیا ہو۔ لیکن ہچکیاں بدستور جاری تھیں۔

قوی ہیکل آدمی پھر بھیانک چہرے والے کے پاس جا بیٹھا۔

”تم نے اس کا منی بیگ اڑایا تو بہت صفائی سے مگر استادوں کی نظروں سے کہاں چھپ گئے ہو۔“ اس نے کہا۔

”اچھا جی.....!“ بھیانک چہرے والا بولا۔

”آدمی تاؤ باز معلوم ہوتے ہو۔“

”تو پھر.....!“

”نکالو..... آدھے آدھے کی رہی۔“ قوی ہیکل آدمی نے کہا۔

بھیانک چہرے والا ہنسنے لگا۔

”تو نہ جانے کیسی بات کر رہا ہے، تلاشی لے لے مرے یار، تجھے دھوکا ہوا ہے۔“

بھیانک چہرے والے نے کہا۔

دوسرے آدمی نے اچھی طرح اس کی جامہ تلاشی لی۔ وہ کھڑا مسکراتا رہا۔

”سچ سچ مجھے دھوکا ہوا۔“ اس نے بیٹھ کر شرمندگی کے لہجہ میں کہا۔

”اچھا اب دیکھ..... یہ رہا منی بیگ۔!“ بھیانک چہرے والے نے نہ جانے کہاں سے

منی بیگ نکال کر اس کے چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

”اچانک قوی ہیکل آدمی نے پستول نکال لیا۔“

”خبردار..... منی بیگ میرے حوالے کر دو۔ میں جاسوس ہوں۔“

”ابے جا، تیرے جیسے بہت سے جاسوس دیکھے ہیں، ابھی ابھی ایک جاسوس کے پٹھے کو

الو بنا کر آ رہا ہوں۔ ابے پہلے اپنی صورت تو دیکھ۔“ بھیانک چہرے والے نے اس کا پستول

والا ہاتھ پکڑ کر اس کی کینٹی پر اس زور کا گھونہ رسید کیا کہ پستول اس کے ہاتھ میں آ گیا اور قوی

ہیکل آدمی ایک ہنسنے کی طرح اچھل کر دور جا گیا۔ بھیانک چہرے والے نے قہقہہ لگایا، پھر وہ

آہستہ آہستہ اسکی طرف بڑھا۔ قوی ہیکل آدمی ابھی تک چاروں شانے چت فرش پر پڑا ہوا تھا۔

”اٹھ میرے لال!“ بھیانک چہرے والا چکارتا ہوا بولا۔ ”پیل تجھے دودھ پلاؤں۔“

قوی ہیکل آدمی بیگلی بلی کی طرح چپ چاپ اٹھ بیٹھا۔

”میں نے ابھی تک یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس میں ہے کتنا۔“ بھیانک چہرے والے نے

منی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ”چہرے..... صرف دو سو روپے..... کوئی غریب آدمی معلوم ہوتا

ہے۔ پچارے کا منی بیگ پھر اس کی جیب میں رکھ دینا چاہئے۔“

”کیوں..... واپس کیوں کرو گے۔“ قوی ہیکل آدمی بولا۔

”ابے میں کوئی معمولی چور اچکا یا گرہ کٹ نہیں ہوں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی رقمیں تو میں محلہ

کے لوٹروں کو بانٹ دیتا ہوں۔“

”یار تم تو بڑے کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ چلو تمہیں اپنے استاد سے ملاؤں۔“

”وہ بھی تیری ہی طرح لوٹا ہوگا۔“

”ہے تو لوٹتا ہی، پر بڑا بھیانک ہے۔“

”ابے جا، کچھ تو ہے کچھ تیرا استاد ہوگا۔ اچھا چل..... اب اس کا روپیہ اس کی جیب میں

ڈال دیں، ورنہ پچارا مفت میں پریشان ہوگا۔“

”واقعی تم عجیب آدمی ہو۔“

”اچھا اب باتیں مت بناؤ۔“ اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ حمید کے قریب رک گیا اور اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لیا میرا نمونہ، چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔“ کہہ کر وہ لاؤنج کے باہر چلا گیا۔ قوی ہیکل آدمی بھی اس کے ساتھ تھا۔

تنبیہ

حمید تھوڑی دیر تک اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک اچھی خاصی حماقت کی تھی۔ تجوری میں اس نے جو تحریر پائی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ تجوری کھولنے والا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے بغیر بھیج بدلے اس کے سامنے ہرگز نہ آنا چاہئے تھا۔

ایسی غیر معمولی قوت رکھنے والا آدمی آج تک اس کی نظروں سے نہ گذرا تھا۔ اس کا گھونہ تھا یا بجلی کے کرنٹ کا دھچکا۔ جس نے اتنے کیم شیم آدمی کو اتنی دور اچھا لیا تھا۔ خود اس کی پنڈلی میں جہاں اس نے ٹھوکر ماری تھی اس طرح کا درد ہو رہا تھا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ اس نے کئی بار اٹھنا چاہا لیکن ہمت نہ پڑی۔ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں پھر اس سے ٹڈ بھینڑ نہ ہو جائے۔ آج سے قبل اس کے دل میں کبھی اتنی بزدلی کے خیالات نہ پیدا ہوئے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ ہمت کر کے اٹھا، آہستہ آہستہ شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ پنڈلی کی چوٹ لنگڑانے پر مجبور کر رہی تھی۔ بہر حال اس وقت حمید کی حالت کسی پھوہڑ قسم کے شرابی کی سی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔ حمید سڑک پر آ گیا اور ٹیکسی کر کے گھر پہنچا۔ سب سے پہلے وہ تجوری والے کمرے میں گیا۔ ایک چیز ابھی تک اس کے ذہن میں خلس پیدا کئے ہوئے تھی اور وہ یہ کہ آخر تجوری میں سے کیا چیز غائب ہوئی۔

اس نے تجوری کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نچلے خانے میں غور سے دیکھنے پر اسے ایک جگہ

ایک تیلی سی دراز نظر آئی۔ وہیں قریب ایک کیل ابھری ہوئی تھی جس کا وہاں پر موجود ہونا ظاہر کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ حمید اس پر ہلکی ہلکی انگلی پھیرنے لگا۔ بے خیالی میں شاید اس کیل پر دباؤ پڑ گیا۔ دفعتاً ایک کھٹکا ہوا اور وہ دراز پھیلنے لگی۔ یہ ایک پوشیدہ خانہ تھا۔ حمید نے اس میں ہاتھ ڈال دیا، وہ خالی تھا۔ حمید سوچنے لگا۔ ضرور اسی خانہ سے وہ کوئی چیز لے گیا ہے۔ فریدی نے آج تک اسے اس خانہ کے متعلق نہ بتایا تھا۔ حالانکہ تجوری کی چابی عموماً اسی کے پاس رہا کرتی تھی۔ حمید نے تجوری بند کر دی۔ اس کے بعد کمرے کو مقفل کر کے کھانے کے کمرے میں آیا۔

فریدی کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے ملازم پریشان نظر آ رہے تھے۔ گھر پر ایک عجیب سا ماحول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں کہاؤنڈ میں گونج اٹھتی تھیں۔

حمید کھانا کھانے جا ہی رہا تھا کہ شہناز آگئی۔

”کہئے حمید صاحب، خیریت تو ہے۔ یہ فریدی بھائی کا کیا معاملہ ہے۔ مجھے ابھی ابھی

معلوم ہوا ہے۔“ شہناز نے پوچھا۔

”معاملہ اتنا مختصر نہیں کہ چند جملوں میں بتا سکوں۔ بیٹھو کھانا کھاؤ..... سب کچھ بتاتا

ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”کھانا کھا کر آئی ہوں۔“ شہناز نے کہا۔

”تھوڑا اور سکی۔“

”نہیں.....!“

”تمہاری خوشی۔“

”آپ تو ذرا ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتے ہیں۔“ شہناز تک کر بولی۔

”تم غلط سمجھیں..... میں ذرا بڑے نوالے کھانے کا عادی ہوں اسلئے منہ کا پھولنا سبب ہے۔“

”تو آخر آپ اس طرح منہ بگاڑ کر کیوں باتیں کر رہے ہیں؟“

”کیا آج لڑنے کا ارادہ کر کے آئی ہو۔“

”لیجئے صاحب چلی جاتی ہوں۔“ شہناز اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”ارے..... نہیں بھائی۔“ حمید نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔
 ”نہیں میں عرصہ سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کو میری صورت دیکھ کر کچھ جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔“

”تو میں نے کیا کہہ دیا بابا.....!“ حمید اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔
 ”کچھ نہیں..... آپ تو بڑے بھولے ہیں۔“
 ”نہیں..... میں اُلُو کا پٹھا ہوں۔“

”کیوں اپنے منہ میاں مٹھو بن رہے ہو۔“ شہناز بے اختیار ہنستے ہوئے بولی۔
 ”خیر تمہیں ہنسی تو آئی۔“ حمید نے کہا۔

”کھانا کھا چکنے کے بعد حمید نے پوری داستان کہہ سنائی۔ لیکن اپنے اور فریدی کے ڈاکر ڈالنے کے واقعات نہیں بتائے۔“

”میں کیا بتاؤں..... میں نے آج تک اتنا بھیا نک چہرہ نہیں دیکھا۔“ حمید بولا۔
 ”کہیں وہ فریدی صاحب ہی نہ ہوں۔ کیا آپ کرٹل پر کاش والا واقعہ بھول گئے۔“

شہناز نے کہا۔

”خیال تو مجھے بھی آیا تھا، لیکن یہ ناممکن ہے۔ فریدی صاحب بھیس ضرور بدل سکتے ہیں لیکن وہ اتنی طاقت کہاں سے لائیں گے۔ سوچ کر حیرت ہوتی ہے بھی اس کا مد مقابل گھونسا پڑتے ہی اس بُری طرح اچھلا تھا جیسے ربڑ کی گیند۔“

”واقعی تعجب کی بات ہے۔“

”اور تو اور یہ دیکھو.....!“ حمید نے اپنی پتلون کا ایک پانچواں سینٹے ہونے کہا۔ ”ظالم نے ایک ٹھوکر مجھے بھی رسید کی تھی۔ یہ دیکھو پنڈلی میں ورم آ گیا ہے۔“

”بھئی خدا کے لئے آپ اس کے پیچھے مت لگئے۔“

”جو کچھ ہوا میری حماقت سے ہوا۔ جب میں یہ جانتا تھا کہ وہ مجھے پچھانتا ہے تو مجھے بغیر

بھیس بدلے اس کے پیچھے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔“ حمید نے ہکا۔

”آ خر کیوں.....؟“

”اس لئے کہ فریدی صاحب کو اسی نے غائب کیا ہے۔“

”بھئی میرا دل تو کہتا ہے کہ وہ فریدی صاحب ہیں۔“ شہناز بولی۔

”یہ بھی ناممکن ہے.....!“ حمید نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ فریدی صاحب کو کون جانتا

ہے۔ وہ اتنے طاقت ور ہرگز نہیں۔“

”اچھا خیر چھوڑیے ان باتوں کو..... آپ کے اوپر تو ہر وقت سراغ رسانی کا بھوت سوار

رہتا ہے۔“ شہناز بولی۔

”اچھا تو آؤ بیار کی باتیں کریں۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا بس بس رہنے دیجئے۔“ شہناز نے کھیانی ہنسی کیساتھ کہا۔ ”میں نے یہ کب کہا تھا۔“

”تم کہو یا نہ کہو، ہر عورت مرد سے ہر وقت صرف اپنے متعلق کچھ سننا چاہتی ہے۔“ حمید

نے کہا۔

”آ خر آپ اتنے فلسفی کیوں ہو گئے ہیں۔“ شہناز بولی۔

”فریدی کی صحبت نے مجھے نہ جانے کیا کیا بنا دیا ہے۔“

”اچھا چھوڑیے ان باتوں کو۔“ شہناز بولی۔ ”آ خر فریدی صاحب شادی کیوں نہیں کرتے۔“

”انہیں عورت سے زیادہ اپنا فن عزیز ہے۔ یہ کچھ فریدی ہی پر منحصر نہیں، ہر فنکار شادی

سے گھبراتا ہے۔ وہ عورتوں سے دوستی تو کر سکتا ہے لیکن مستقل طور پر کسی عورت کا پابند ہونا پسند

نہیں کرتا۔“

”آ خر اس کی وجہ.....!“ شہناز بولی۔

”بھئی آٹے دال کا چکر..... اور کیا۔“ حمید نے زنانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ”آج

ساری نہیں ہے۔ کل بلاؤز کم ہو گئے۔ یہ لپ اسٹک اچھی نہیں۔ میں تو کئی کیورا پاؤڈر استعمال کروں گی، ننھے میاں کے جوتے پھٹ گئے۔ منے میاں کو زکام ہو گیا۔ منی کو چھینکیں آرہی ہیں۔ شہناز ہنسنے لگی۔

”عالمبا آپ کو بھی اپنا فن بہت زیادہ عزیز ہوگا۔“ شہناز بولی۔

”مجھے..... نہیں تو، میں اس محکمہ میں فن کے لئے جھک نہیں مار رہا ہوں۔ اس قسم کی

حماقتیں فریدی جیسے لوگ ہی کرتے ہیں۔“

”پھر آخر آپ کس لئے اس محکمہ میں آئے ہیں۔“

”عورت کے لئے.....!“ حمید نے کہا۔

”کیا مطلب۔“ شہناز تیز لہجہ میں بولی۔

”کوئی خاص مطلب نہیں۔ کسی بیکار آدمی کو تو کوئی اپنی بیٹی دیتا نہیں۔“

”اوہ.....!“

”اور تم کیا سمجھی تھیں۔“

”کچھ نہیں۔“

”خیر..... بہر حال..... ہاں تو پھر میں اپنی شادی کب کر رہا ہوں۔“

”میں کیا جانوں۔“

”ارے تو کیا تم میرے ساتھ شادی نہ کرو گی۔“

”دیکھئے فضول باتیں نہ کیا کیجئے۔ اگر میرا بیٹھنا ناگوار ہو تو صاف صاف کہہ دیجئے۔“

”اچھا جی..... یہ باتیں فضول کب سے ہو گئیں۔“

”جب سے آپ نے اپنا رویہ بدل دیا۔“

”کیا تمہیں کوئی میرے خلاف بہکایا کرتا ہے۔“

”ہاں.....!“

”کون ہے وہ الو کا پٹھا۔“

”میرا دل۔“

”تب تو وہ آدمی کا پٹھا ہے.....!“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”آخر کیوں۔“

”اس لئے کہ آپ مجھ سے کافی کھینچے کھینچے رہتے ہیں۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک نوکر ہاتھ میں ایک لفافہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

”ابھی ابھی ایک آدمی دے گیا ہے۔“ نوکر نے لفافہ حمید کو دیتے ہوئے کہا۔

لفافے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ حمید نے خط جو انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا لفافے سے

نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

”میں دوسری مرتبہ تمہیں متنبہ کر رہا ہوں کہ میرے پیچھے مت لگو، ورنہ انجام کے ذمہ دار

تم خود ہو گے۔ تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میرے خلاف تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی ثبوت

نہیں۔ تمہارے استاد بخیریت ہیں، میرا جو مقصد تھا حل ہو گیا۔ مجھے تم سے یا ان سے کوئی دشمنی

نہیں۔ میں انہیں جلد چھوڑ دوں گا۔ انہیں میرے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اگر میں انہیں اس

وقت غائب نہ کر دیتا تو وہ حضرت قتل کر دیئے جاتے۔ تم دونوں کے کروت سے میں اچھی طرح

واقف ہوں۔ تمہارے استاد کا قاتل وہی تھا جس نے سینٹھ اگر وال پر گولی چلائی تھی۔ وہ آج

بھی فریدی کی تلاش میں ہے۔ اگر تم میں تھوڑی سی بھی عقل ہو تو اب میرا پیچھا مت کرنا۔ میں

اتنا گھاس نہیں ہوں اس سے زیادہ مجھے اب کچھ نہیں کہنا۔“

حمید نے خط پڑھ کر شہناز کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھتے ہی شہناز کے چہرے پر

گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔

”تو پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔“ شہناز بولی۔

”ارے ایسے ایسے بہت دیکھے ہیں۔ شیر طاقت سے مارتا ہے اور گیدڑ مکاری سے۔ ایسا

پھنساؤں بیٹا کو کہ عمر بھریا د کریں۔“

”تو آپ اس کا پیچھا کریں گے۔“

”یقیناً.....!“

”اور میرا کہنا بھی نہ مانیں گے۔“

”بس اسی لئے تو فریدی صاحب شادی نہیں کرتے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“

”خیر..... جو آپ کا دل چاہے کہئے۔“ شہناز نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو اچھا نہ ہوگا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اس سے ملی ہوئی ہو۔“

”دیکھئے مذاق میں مت ٹالئے۔“ شہناز نے کہا۔ ”اب مجھے بھی زبردستی کرنی پڑے گی۔“

”وہ زبردستی کس قسم کی ہوگی۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”وہ بھی دیکھ لیجئے گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نہیں چاہتیں کہ میری جان خطرے میں پڑے۔“ شہناز

نے سر ہلا دیا۔

”آ خر کیوں.....؟“

”بس یونہی.....!“

”کوئی وجہ.....!“

”نہیں بتاتی وجہ۔“

”تو ہم بھی نہیں باز آتے۔“

”اگر نہیں باز آتے تو میں زہر کھالوں گی۔“

”تو کیا واقعی تم مجھے اتنا ہی چاہتی ہو۔“

”یہ میں نے کب کہا ہے۔“

”خیر تم اپنی زبان سے کبھی نہ کہو گی۔“

شہناز کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”اوہ..... گیارہ بج گئے۔“ شہناز نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب چلنا چاہئے۔

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر کیا پیدل جاؤ گی۔ اب اس وقت شاید قریب کوئی سواری بھی نہ مل

سکے۔ فریدی صاحب کی کار بگڑی پڑی ہے۔ کل اسے درکشاپ بھجوا دوں گا۔“

”تو کیا ہوا.....!“ شہناز نے کہا۔ ”شہلی ہوئی چلی جاؤں گی۔“

”میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھا“ شہناز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا اسی طرح چلے گا۔ جی نہیں

الشر پہن لیجئے بہت سردی ہے۔“

”اچھا بھئی۔“

دونوں آہستہ آہستہ بیلی روڈ کی طرف چل دیئے۔ سڑک پر بالکل سناٹا تھا۔ تھوڑی ہی دور

چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک ٹیکسی آگئی۔ حمید نے آواز دے کر اسے رکوادیا۔

”واقعی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اس وقت ٹیکسی مل گئی۔“

”بیلی روڈ!“ شہناز نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”دیکھئے جو کچھ میں نے کہا اس کے خلاف نہ ہونے پائے۔“

”اچھا.....!“ حمید نے کہا۔ ”شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ بیلی روڈ پر پہنچ کر ڈرائیور نے پوچھا ”کدھر.....!“

”پندرہ سوئیں.....!“ شہناز نے بتایا۔

ٹیکسی شہناز کے مکان کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا اور شہناز

ٹیکسی سے باہر آئی۔

”یہ لو.....!“ شہناز نے پرس سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”میں کرایہ نہیں لیتا۔“

شہناز چونک پڑی۔ اس نے نیچے سے اوپر تک اسے دیکھا۔ یہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔

اس نے اپنے الشر کے کالر کان کے اوپر تک کھڑے کر رکھے تھے اور نائٹ کیپ چہرے پر جھکا

رکھی تھی۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“ شہناز نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجہ میں کہا۔
”میری اجرت صرف اتنی ہے کہ آپ سارجنٹ حمید کو میرا پیچھا کرنے سے کسی طرح روک دیجئے، ورنہ مفت میں اس کی جان جائے گی۔“

”تو کیا آپ..... تو کیا آپ.....!“ شہناز نے لرزتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں..... میں وہی ہوں جس کا تذکرہ آپ سے سارجنٹ حمید نے کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بلاوجہ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لیکن اپنے راستے میں آئے ہوئے آدمیوں کو معاف کر دینا میرے بس سے باہر ہوتا ہے۔ اچھا اب جائیے..... حمید کو اچھی طرح سمجھائیے گا..... شب بخیر۔“

اس نے کار اشارت کر دی۔ شہناز تھیر تھیری تیزی سے دوڑتی ہوئی کار کو دیکھ رہی تھی۔

کچھ نئی باتیں

دوسرے دن حمید ذرا دیر سے آفس پہنچا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چیف انسپکٹر کے یہاں طلبی ہوئی۔

”آج تم دیر میں آئے۔“

”جی ہاں دیر ہوگئی بات یہ ہے کہ کل کافی رات گئے تک ایک مشتبہ آدمی کے پیچھے رہا۔“

”کس کیس کے سلسلہ میں۔“

”انہیں عجیب و غریب ڈاکوؤں کے کیس کے سلسلہ میں؟“

”میرے خیال سے تو ابھی میں نے یہ کیس کسی کے سپرد نہیں کیا۔“

”کیا عرض کروں۔ فریدی صاحب کا اس طرح غائب ہو جانا میرے لئے بہت زیادہ

تکلیف دہ ہے۔“

”اور کہیں تمہارا بھی غائب ہو جانا ہم سب کے لئے تکلیف دہ نہ ہو جائے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”تم لوگوں کا اس طرح بغیر کچھ کہے سنے کوئی کام شروع کر دینا مجھے قطعاً ناپسند ہے اور فریدی کو تو جیسے اس کا خط ہو گیا ہے..... خیر یہ دیکھئے۔“

چیف نے ایک کانغذ حمید کی طرف بڑھا دیا جس کے اوپر کسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ کیا تم انہیں پہچان سکتے ہو۔ چیف نے پوچھا۔

حمید تھوڑی دیر تک ان نشانات کو دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا کر چیف کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چیف نے گھٹی بجائی۔ ایک سارجنٹ کمرے میں داخل ہوا۔

”ایف دو سوسات۔“

سارجنٹ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک چمڑے کا تھیلا لا کر میز پر رکھا۔ چیف نے تھیلا کھول کر میز پر الٹ دیا۔ بہت سے کانغذات میز پر بکھر گئے اس نے ان میں سے ایک کانغذ نکالا اس پر انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس نے وہ کانغذ بھی حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”دونوں کو ملاؤ۔“

”دونوں ایک ہی آدمی کی انگلیوں کے نشانات معلوم ہوتے ہیں۔“ حمید نے غور کرتے ہوئے جواب دیا۔

”جانتے ہو کس کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“ چیف نے کہا۔

حمید کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ منہ فقی ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ نشانات تجوری پر سے تو نہیں حاصل کئے گئے؟ اگر ایسا ہے تو بڑے پھنے، اس نے چیف کے چہرے کو بغور دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دماغ پر گھونہ رسید کر دیا۔ چیف اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر بولا۔

”گھبراؤ نہیں..... سب خیریت ہے۔ فریدی زندہ ہے۔“ چیف نے کہا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

”دیکھو فریدی کی عرضی ایک ماہ کے لئے رخصت کے لئے آئی ہے۔“ چیف نے ایک کانگد اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ نشانات میں نے اس غرض سے حاصل کئے ہیں۔ عرضی چونکہ ٹائپ کی ہوئی ہے اور اس پر فریدی کے دستخط بھی نہیں ہیں اس لئے مجھے خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ بھی بد معاشوں کی کوئی چال ہے۔ اس لئے اس پر انگلیوں کے نشانات دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ میرا خیال ہے کہ فریدی پوشیدہ طور پر تفتیش کر رہا ہے اور یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ وہ پتہ لگائے بغیر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔“

حمید کے ذہن میں وہ بھیا نک چہرہ ناپنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ بھی اس کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ فریدی صاحب تو غائب ہونے کے بعد اپنی پرچھائیں تک سے بھڑکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کا باہر سے چھٹی کی درخواست دے کر جمانا کہ میں یہاں موجود ہوں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عرضی میں یہ بھی نہیں لکھا تھا کہ وہ بھیجی کہاں سے گئی ہے۔ اگر خود فریدی صاحب کا ارادہ روپوشی کا ہوتا تو وہ کبھی چھٹی کی درخواست نہ دیتے کیونکہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

”بہر حال حالات ناسازگار ہیں۔“ چیف نے کہا۔

”جی ہاں.....!“

”اچھا کل رات تم پیچھا کس کا کر رہے تھے۔“

”ایک بہت ہی بھیا نک آدمی کا جسے میں نے ناوٹی میں دیکھا تھا۔“

”ناوٹی..... وہی جس کا مالک سنتوش ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”اس پر تو عرصہ سے ہم لوگوں کی نظریں ہیں لیکن کبھی ایسا بہانہ ہاتھ نہیں آتا کہ اس کا قلع قمع کیا جاسکے۔ وہ عیاشی کا ایک کھلا ہوا اڈہ ہے۔ لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جس کی بناء پر کوئی کارروائی کی جاسکے۔“

”دراصل یہی چیز مجھے وہاں لے گئی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اس ہوٹل میں عیاشی سے بھی زیادہ بھیا نک کوئی کام ہوتا ہے میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ان وارداتوں کے سلسلے میں اس ہوٹل کا بھی کوئی نہ کوئی حصہ ضرور ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ فریدی کے غائب ہوتے ہی اچانک یہ وارداتیں ہونی کیوں رک گئیں۔ جب کہ متواتر یہ سلسلہ جاری تھا۔“ چیف نے کہا۔
حمید پھر بوکھلا گیا۔

”میرے خیال سے تو اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ فریدی کے غائب ہوتے ہی معاملہ خفیہ پولیس کے سپرد کر دیا گیا ہے۔“

”اچھا ایک اور چیز میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ چیف نے کہا ”کہ آخر فریدی کی عرضی پر اس کے دستخط کیوں نہیں ہیں۔ ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ ٹائپ کی ہوئی بغیر دستخط کی عرضیاں منظور نہیں ہوا کرتیں۔ میرا خیال ہے کہ اس عرضی کے سلسلے میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی گئی ہے۔ فریدی نے عملاً اس پر دستخط نہیں کئے تاکہ ہماری توجہ خاص طور پر اس کی جانب مبذول ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”صرف سوچنے سے کام نہ چلے گا۔ ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ ابھی تک جو کچھ بھی ہوا ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں اور یہ طریقہ اختیار کر کے ہم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ ابھی تک اس سلسلے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ واردات والی رات کو پولیس کی وہ لاری اسٹیشن کے پھانگ پر دیکھی گئی تھی جسے ڈاکو اڑالے گئے تھے جو شخص اس لاری کو چلا رہا تھا اس کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ اس تصویر سے بہت ملتا جلتا ہے۔“ چیف نے میز کی دراز سے ایک تصویر نکال کر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ تو وہی ہے۔“ حمید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”کون.....!“

”رات جس کا میں پیچھا کر رہا تھا۔“

”بہت اچھے۔“ چیف انسپکٹر خوشی سے چنچا۔ ”تو کیا وہ تمہیں ناوٹی میں ملا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”تو یہ کہو کہ سچ سچ ناوٹی آج کل بد معاشوں کا زور ہو رہا ہے۔“ چیف نے کہا۔

”جانتے ہو، یہ کون ہے۔“

حمید نے نفی میں سر ہلادیا۔

”دلاور خان مشہور پشاوری قاتل، اس نے بہت سے خون کئے ہیں۔ دس سال ہوئے یہ افغانستان بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد سے قطعی لاپتہ رہا۔ اچانک پھر دکھائی دیا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس کی رہائش گاہ کا بھی پتہ لگایا یا نہیں۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آنے پائی۔ وہ شاید مجھے پہچانتا تھا۔“

اس کے بعد حمید نے ہوٹل کی ساری داستان بیان کر دی۔

”بھئی وہ بے پناہ طاقت کا آدمی ہے۔ ایک بار اس نے صرف ایک گھونٹہ میں ایک آدمی کی جان لی تھی۔ خیر اگر واقعی وہ اس شہر میں موجود ہے اور اس واردات میں اس کا بھی ہاتھ ہے تو سچ کر نہیں جاسکتا۔“

چیف نے گھٹی بجائی۔ ایک آدمی اندر آیا۔

”انسپکٹر بیڑجی کو سلام دو۔“ چیف نے کہا۔

انسپکٹر بیڑجی کو آتا دیکھ کر حمید کھڑا ہو گیا۔

آج آپ کو دہلی ایکسپریس دیکھنا ہے۔“ چیف نے سب انسپکٹر بیڑجی سے کہا۔

”جی ہاں..... میں جا ہی رہا تھا۔“ سب انسپکٹر بیڑجی انگریزی میں بولا۔ ”لیکن صاحب

مجھے کوئی ایسا آدمی دیجئے جو واقعی کام کا ہو۔“

”حمید کو لے جائیے۔“

”بہتر ہے۔“ سب انسپکٹر نے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دہلی ایکسپریس کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ حمید اور انسپکٹر بیڑجی پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ دفعتاً حمید ایک آدمی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ کوئی مارواڑی سیٹھ تھا۔ اس کا سامان پلیٹ فارم پر رکھا ہوا تھا۔ غالباً وہ بھی دہلی ایکسپریس کے انتظار میں تھا۔ حمید کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اسے گذشتہ رات کو ناوٹی میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی حمید کے ذہن میں فوراً خیال گونجنے لگا تھا کہ وہ کیوں نہ آج اس مہارواڑی کے بھیس میں ہوٹل جائے۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مارواڑی اس ہوٹل کا کوئی مستقل گاہک ہے کیونکہ پچھلی رات وہ کافی دیر تک ہوٹل کے فیبر سے باتیں کرتا رہا تھا اور دونوں کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا جس سے بے تکلفی کی بو آتی تھی۔ حمید سوچنے لگا کہ ضرور یہ کوئی لمبا سفر کرنے جا رہا ہے۔ تبھی تو اس کے ساتھ اتنا سامان ہے۔ مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ وہ خود سفر کرے گا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ وہ کسی کو رخصت کرنے آیا ہو۔

حمید کی نظریں اس مارواڑی سیٹھ پر تھیں اس کا سامان ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں رکھا جا رہا تھا۔ پورا کمپارٹمنٹ ریزرو تھا۔ حمید نے ریزرویشن کارڈ پڑھا ڈبہ بمبئی تک کے لئے ریزرو ہوا تھا۔ مارواڑی کو اس ڈبہ میں تنہا بیٹھے دیکھ کر حمید کی جان میں جان آئی۔ وہ رات کے لئے پروگرام بنانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد انجن نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

”کہئے صاحب سب ٹھیک تھا۔“ حمید نے انسپکٹر سے پوچھا۔

”ٹھیک ہی تھا کیونکہ ہمارا لوگ کا ڈیوٹی لگایا جاتا ہے۔“ انسپکٹر بیڑجی نے کہا۔

آج حمید کے لئے اس وقت اسٹیشن آنا بہت ہی کارآمد ثابت ہوا۔

ہنگامہ

حمید شام کو جب گھر لوٹا تو شہناز کو اپنے انتظار میں پایا۔ حمید کو دیکھتے ہی وہ اچھل پڑی۔

رات کا واقعہ اتنے سہمے ہوئے لہجے میں بتانے لگی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں وہ خوفناک چہرے والا نہیں آس پاس چھپا ہوا اس کی گفتگو نہ سن رہا ہو۔

”میں نے خود ہی اپنا فیصلہ بدل دیا ہے کون خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈالے۔“
حمید نے کہا۔

”مجھے یقین کامل ہے کہ فریدی صاحب بخیریت ہیں اور پوشیدہ طور پر اپنا کام کر رہے ہیں۔“ شہناز نے کہا۔

”میں تو اب تنگ آ گیا ہوں۔ خود بلاوجہ خطرے میں پھاند پڑتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی لپیٹتے ہیں۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا ”اور پھر بعد میں شکایت کرتے ہیں کہ تم نے میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہ کی۔ میں تو بہت جلد اس خدمت سے استعفیٰ دے دوں گا۔ میرے پاس اتنا روپیہ اکٹھا ہو گیا ہے کہ باسانی کوئی تجارت کر سکتا ہوں۔“

”بس بنانے لگے ہوئی قلعے۔“ شہناز ہنس کر بولی۔ ”کتنا سرمایہ اکٹھا کر لیا ہے آپ نے۔ آپ کی تنخواہ ہے ہی کتنی۔“

”میرے پاس بیس ہزار روپیہ ہے۔“

”بیس ہزار..... کہاں ڈاکہ مارا تھا۔“

”ایک مرتبہ ایک کیس کے سلسلہ میں میں نے اور فریدی صاحب نے سادھو بن کر چالیس ہزار روپیہ کمایا تھا۔“

”تو اس میں سے بیس ہزار روپے آپ کو ملے تھے۔“

”نہیں پورے چالیس ہزار، فریدی صاحب اس قسم کی رقمیں نہیں رکھتے اور پھر انہیں کی کس بات کی ہے۔ لکھنؤ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔“

”تو بقیہ بیس ہزار کیا ہوئے؟“

”بیس ہزار تو الگ ہیں۔ ان کو تو میں ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ بقیہ بیس ہزار میں سے صرف دس ہزار رہ گئے ہیں۔“

”دس ہزار..... باقی کیا ہوئے۔“

”کمال کر دیا..... ارے بھئی وہ خرچ ہو گئے۔ بھلا کوئی ہندوستانی جا سوس صرف تنخواہ کے بل پر اتنی نوابی کر سکتا ہے۔“

”تو یہ کہئے کہ آپ خیرات کے پیسوں سے مزہ کر رہے ہیں۔“

”خیرات کے کیوں۔“

”خیرات نہیں تو اور کیا۔ سادھو اور فقیروں کو خیرات نہیں دی جاتی تو اور کیا؟ بیچارے غریبوں کی گاڑھے پیسے کی کمائی کو آپ لوگوں نے دھوکہ دے کر لوٹ لیا۔“

”ایسا تو نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ مہارانی صاحبہ کا عطیہ ہے۔ چار سال ہوئے ہم لوگ

ایک قاتل کی تلاش میں بنارس گئے وہاں پتہ چلا کہ وہ ایک بہت بڑے گروہ کا سرغنہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی اور وہ خود عموماً سادھوؤں کے ہمیں میں رہتا ہے۔ لہذا ہم لوگوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ فریدی کی شعبہ بازیوں کی وجہ سے ہم لوگ بہت جلد مشہور ہو گئے۔ ایک بار فریدی نے کمال کر دیا۔ رات کا وقت تھا۔ فریدی کے دربار میں معتقدین کا جھمکتا تھا۔ دفعتاً زور کی آندھی چلی، سارے چراغ گل ہو گئے لیکن فریدی صاحب کا چہرہ اندھیرے میں جگمگا رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا نعرے گونجنے لگے۔ آندھی ختم ہو جانے کے بعد چراغ دوبارہ جلانے گئے۔ اب ان کا چہرہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے سارا

بنارس الٹ پڑا۔ دور دور سے لوگ درشن کے لئے آنے لگے۔ روزانہ ہزاروں روپے کی

بھینٹ چڑھتی تھی، لیکن فریدی صاحب سب کو واپس کر دیتے تھے۔ ایک دن مہارانی صاحبہ ان کے درشن کو آئیں۔ یہ بیچاری اس وقت حاملہ تھیں کہ قدم اٹھانا دو بھر ہو رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک ٹریبیٹی تھی اور وہ یہ کہ ان کا ہر بچہ مردہ پیدا ہوتا تھا۔ فریدی صاحب نے انہیں بہت زیادہ

ڈپٹ کر دعا دی۔ جاتے وقت انہوں نے کچھ نذر کرنا چاہا مگر چونکہ میں فریدی صاحب کی عادت سے واقف تھا اس لئے میں نے ان کے بولنے سے قبل ہی رانی صاحبہ سے کہہ دیا کہ اس کا نام بھی نہ لیجئے گا ورنہ مہاتما جی ناراض ہو جائیں گے۔ مہارانی صاحبہ لوٹ گئیں۔ ان کے

کہ شہناز یہ سن کر کہ ابھی اسے پھر چیف انسپکٹر کے یہاں جانا ہے چلی جائے گی اور وہ اطمینان سے آج رات کے پروگرام پر غور کرے گا۔ لیکن شہناز ٹس سے مس نہ ہوئی۔ حمید کو اختلاج ہونے لگا۔ آخر کس طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ وہ پھر دلاور خاں کے چکر میں جا رہا ہے تو وہ اس کا ناٹھہ بند کر دے گی۔ شہناز کی زبردستیوں پر اکثر اسے غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ فریدی واقعی بڑا عقلمند ہے جب محبوب کے ہاتھوں یہ حال ہو جاتا ہے تو بیوی کتنی خطرناک ثابت ہوتی ہوگی۔

”ارے بھئی ذرا جلدی کھانا تیار کرو۔“ حمید نے نوکر کو آواز دے کر کہا۔ ”مجھے جلد ہی جانا ہوگا۔“

”ایسی بھی کیا جلدی۔“ شہناز بولی۔ ”ڈیوٹی تو پوری ہی کر آئے ہیں اب ذرا دیر ہی سہی۔“

”ہم لوگ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔“

”نہیں کرنے کی باتیں ہیں۔“

”آپ سے زیادہ ڈرپوک آدمی میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔“ شہناز طنز یہ لہجہ میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے اپنی اتنی عمر مفت ضائع کی۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ تم نے اب تک کوئی ڈرپوک آدمی نہیں دیکھا۔“

”دیکھ تو رہی ہوں۔“

اتنے میں کھانا آ گیا۔ دونوں نے کھانا کرنے کے بعد پھر لڑنا شروع کر دیا۔

”اچھا بھئی..... اب چلنا چاہئے۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو تم کو تمہارے گھر

چھوڑ کر میں چیف کے یہاں چلا جاؤں گا۔ آج گاڑی بن گئی ہے۔“

حمید نے کار نکالی اور شہناز کو لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے گھر چھوڑ کر

وہ یونہی بلا مقصد بڑی دیر تک سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ تقریباً آٹھ بجے وہ گھر لوٹا اور سیدھا

جانے کے بعد فریدی صاحب نے مجھے خوب ڈانٹا اور کہا کہ ایسی موٹی اسامیوں کا مال جائز ہے۔ مہارانی صاحبہ اپنے حمل کے دن پورے کر رہی تھیں۔ تین چار دن کے بعد ان کے بچہ ہوا لیکن اس بار وہ سچ مچ زندہ رہا۔ ایک ہفتہ کے بعد مہاراجہ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور ہمارے مہاتما کو ڈنڈوت کر کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ رہے۔ میرے شیر کے رعب کا یہ عالم تھا کہ مہاراجہ صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر ڈرتے ہوئے انہوں نے ہزار ہزار کی چالیس لکڑیاں مہاتما کے جنوں میں رکھ دیں۔ مہاتما نے ایک ٹھوکریں کی لیکن میں نے بہت احتیاط سے انہیں اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ مہاراجہ صاحب نے التجا کی کہ ہم لوگ بتاؤں چھوڑ کر انہی کی ریاست میں رہیں۔ لیکن مہاتما جی نے وہ ڈانٹ پلائی کہ اوسان خطا ہو گئے۔ یہ ہے ان رویوں کی کہانی۔“

شہناز بڑی توجہ کے ساتھ سن رہی تھی۔

”آرخان کا چہرہ چمکنے کیسے لگا تھا۔“ شہناز بولی۔

”خود فریدی کے تیار کردہ ایک نسخہ کی کرامت تھی۔“

”بھئی کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔“ شہناز نے کہا۔ ”اچھا پھر اُس ڈاکو کا کیا ہوا۔“

”دھر لیا گیا!“ حمید نے کہا۔ ”بھلا فریدی کسی کام میں ہاتھ ڈالے اور وہ ادھر رہ جائے۔“

”تو بہر حال آپ لوگ اس طرح اچھی خاصی دولت پیدا کر لیتے ہیں۔“ شہناز نے کہا۔

”اور اس پر بھی آپ استغنیٰ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”کیا کیا جائے..... سکون نہیں ملتا۔“ حمید بولا۔ ”اب یہی دیکھ لو کہ ابھی ابھی دفتر سے

آ رہا ہوں۔ اب ایک گھنٹہ کے اندر مجھے چیف کے بنگلہ پر پہنچنا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسی حالت

میں کوئی شریف آدمی اس قسم کی ملازمت کیسے گوارا کر سکتا ہے۔“

”کیوں اب کہیں جانا ہے۔“ شہناز نے کہا۔

”کچھ نہیں معلوم..... بس حکم ملا ہے۔“

”واہ یہ اچھی رہی۔“ شہناز نے کہا اور پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں پھیڑ دیں۔ حمید سمجھ رہا تھا

اس آدمی نے دانت نکال دیئے۔

اس کا تو حمید نے پہلے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ یہ آدمی مارواڑی سیٹھ سے کافی بے تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔

”اے بیرا ایک بڑا اسکاچ اور سوڈا بھی لاؤ۔“

بیرا جلد ہی اسکاچ اور سوڈا لے آیا۔ دونوں پینے لگے، آج حمید جی کڑا کر کے زندگی میں پہلی بار پی رہا تھا۔

”کیوں سیٹھ آج کھیل نہ ہوگا۔“ وہ آدمی اسکاچ کی چسکی لے کر بولا۔

”نہیں بھائی، آج طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”آج ایک بڑی عمدہ چیز آئی ہے۔“ وہ آدمی بولا۔ ”میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔“

”اچھا.....!“ حمید مسکرا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اب وہ معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔“

”ہاں سیٹھ..... بس سمجھ لو پکا آم ہے۔“

حمید نیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ دونوں نے جلدی جلدی شراب ختم کی۔

”آؤ چلیں.....!“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

حمید اس کے پیچھے ہولیا۔ ہال سے گذر کر انہیں کچی اور کمروں اور گلیاروں سے گزرتا پڑا۔

ایک کمرے میں پہنچ کر اس آدمی نے ایک الماری سے ربڑ کا تو بڑا نکالا اور حمید کو پکڑا دیا۔ حمید

خفت حیرت میں تھا کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو سیٹھ۔“ وہ حمید کو شش و پنج میں دیکھ کر بولا۔

دھنکا ایک خیال بجلی کی طرح حمید کے ذہن میں کونہ گیا۔

”روز روز وہی پٹی، آگہ تم ہمارا اعتبار کیوں نہیں کرتا۔“ حمید نے وہ تو بڑا اپنی آنکھوں پر

پڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تو بڑا اس کی آنکھوں پر اس طرح فٹ ہو گیا کہ روشنی کی ہلکی سی لکیر بھی

سے نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اب اس آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چلنے لگا۔ وہ

انہوں کی طرح اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ تو بڑے کو ذرا سا کھسکا کر کم از کم

ڈریسنگ روم میں کھس گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ وہاں سے نکلا تو برآمدے کی روشنی گل کر کے اندھرے میں چھپتا چھپاتا نوکروں کی نظروں سے بچتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہ اسی دوپہر والے مارواڑی سیٹھ کے بھیس میں تھا۔ تھوڑی دور پیدل جانے کے بعد اس نے ٹیکسی کی اور ٹاؤٹی جا پہنچا۔ حسب دستور یہاں کافی چہل پہل تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن دلاور خان کہیں نہ دکھائی دیا۔ نیجر نے اسے دور ہی سے سلام کیا۔ حمید دانت نکال کر سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ہال میں نصب کئے ہوئے اس عورت کے بت پر پڑیں جس کے جسم کے گرد آج دوسری ساری لپٹی گئی تھی۔ یہاں یہ بت بھی عجیب و غریب چیز تھا۔ دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ سچ کوئی انتہائی حسین عورت کھڑی ہو۔ روزانہ اس کے کپڑے تبدیل کر دیئے جاتے تھے۔ بت ایک چار پانچ فٹ کے دائرہ نما چوہرے پر نصب تھا۔ ”حمید دیر تک اسے گھورتا رہا۔“

اس نے بیرے سے پیٹر لانے کو کہا اور اونگھنے لگا۔

ابھی بیرا واپس نہیں آیا تھا کہ اسے کل والا وہی قوی ہیکل آدمی دکھائی دیا جو کل دلاور خان کے ہاتھ پٹ گیا تھا۔ وہ سیدھا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ حمید نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا اندازہ تو اس نے کل ہی لگالیا تھا کہ وہ بھی کوئی بد معاش ہے۔ اس نے قریب آ کر موڈ بانہ انداز میں حمید کو سلام کیا اور اسکے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیوں سیٹھ جی آج کیا بات ہے۔ بہت کھوئے کھوئے نظر آرہے ہو۔“

”کوئی بات نہیں.....!“ حمید نے ہسکرا کر کہا اور کھانسنے لگا۔ ”کیا بتاؤں سکھت جھکام

ہم کو ہو گیا ہے۔“

”یہ تو آپ کی آواز ہی بتا رہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”موسم ہی ایسا ہے۔“

”موسم سالاحرامی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”آج اسی لئے پیٹر پی رہا ہوں، تم کیا پوگے۔“

”جو پلا دے میرا سیٹھ۔“

”تم اسکاچ پیو.....!“

راستہ ہی دیکھ لے لیکن ہمت نہ پڑی اور اگر ہمت پڑ بھی جاتی تو وہ ایسا کر ہی کیسے سکتا تھا جبکہ اس آدمی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی زینہ سے نیچے اتر رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ کسی تہہ خانہ میں جا رہا ہے۔ زینہ طے کر نیچے بعد اسے تھوڑی دور اور اسی طرح چلنا پڑا۔ پھر اسکے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے گئے۔ اس نے جلدی سے تو بڑا اتار کر اپنے ساتھی کو پکڑا دیا۔ اس وقت وہ ایک بہت لمبے چوڑے تہہ خانہ میں تھا جہاں بے شمار میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں اور لوگ بیٹھے جو اکیلے رہے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ زمین پر ادندھے پڑے چائڈو پی رہے تھے۔ حمید کا ساتھی اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک کمرے میں آیا۔ یہاں ایک عورت نیم عریاں حالت میں بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ حمید اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ شہر کے مشہور لکھ پتی کی نوجوان بیوی تھی۔

”کیا تمہیں اس گندے مارواڑی کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر تیز لہجہ میں بولی۔ ”دور ہو جاؤ یہاں سے۔“

”سنئے تو سہمی۔“ وہ بولا۔

”میں کچھ نہیں سنتی، تم اچھے خاصے گدھے ہو۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”نکالو اسے یہاں سے..... اگر کوئی اور نہیں تو تم خود کس سے کم ہو۔“

حمید کا ساتھی اسے پھر بڑے کمرے میں لے آیا۔ جہاں لوگ جو اکیلے رہے تھے۔

”سیٹھ تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آیا، پھر دو دو ہاتھ ہوں گے۔“ اس نے کہا اور اسی کمرے میں واپس چلا گیا۔

اب حمید کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دفعتاً وہ چونک پڑا، ایک میز پر دلاور خاں بھی جو اکیلے رہا تھا۔ ایک طرف آدمی بوتل شراب اور گلاس رکھے تھے۔ ہونٹوں میں موٹا سا ساگار دبا ہوا تھا۔ حمید نے پھر ایک بیرے کو بلا کر بیرے کا آرڈر دیا۔ وہ اس میز پر بالکل تنہا تھا۔ جیسے ہی بیرا شراب لے کر آیا کسی طرف سے

دو آدمی اور آ کر میز پر بیٹھ گئے۔

”کیوں سیٹھ کیا ارادہ ہے۔“ ایک نے کہا۔ ”کیا آج کھیلو گے نہیں۔“

”ہوگا کھیل..... مگر زیادہ لمبا نہیں۔“ حمید نے اپنے مصنوعی غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ تو ہو جائے۔“ دوسرا بولا۔

اتنے میں وہ شخص بھی آ گیا جو حمید کو اپنے ساتھ لایا تھا۔

”کہو استاد کسی رہی.....!“ وہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بیٹھ گیا۔

”جیز تو بڑھیا ہے۔“ حمید نے پھوہڑنے کے ساتھ کہا۔

”ہوگی پر اپنے کام کی نہیں۔“ وہ بولا۔

پتے بانٹ دیئے گئے اور وہ چاروں بھی کھیلنے لگے۔ حمید برابر ہارے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ پتے لگائے جا رہے ہیں اس لئے اس نے احتیاط سے کھینتا شروع کر دیا۔ وہ برابر پتے پھینکتا جا رہا تھا۔

”آج چال نہیں چل رہے ہو سیٹھ کیا بات ہے۔“ ایک بولا۔

”آج پیسہ کم ہے۔“ حمید نے ہکا۔

”ارے تم اس کی پرواہ کیوں کرتے ہو۔ ادھار لے لو۔ اپنے ہی آدمی ہو کوئی غیر نہیں۔“

دفعتاً ایک دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ سب چونک پڑے۔ دلاور خاں نے میز الٹ دی تھی اور اب کھڑا ہاتھ میں خالی بوتل لئے ہوئے تول رہا تھا۔ اس کے ساتھ کے تینوں کھلاڑی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

”پتے لگاتے ہو۔“ وہ گرج کر بولا۔

پھر ایک ریوالور چلنے کی آواز سنائی دی۔ لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک قد آور آدمی جس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رکھا تھا ایک ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ سارے تہہ خانہ میں سناٹا چھا گیا۔ کھیل بند ہو گیا، سب لوگ اپنی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے۔ نقاب پوش آہستہ

آہستہ چلا ہوا دلاور کے قریب آیا اور اسکے ہاتھ سے خالی بوتل چھین کر ایک طرف ڈال دی۔

دلاور خاں چپ چاپ کھڑا تھا۔

”کون ہو تم.....!“ نقاب پوش گرج کر بولا۔

دلاور خاں چپ چاپ کھڑا رہا۔

”اسے یہاں کون لایا ہے۔“ نقاب پوش مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں.....!“ حمید کا ساتھی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”یہ وہی ہے جس سے کل میری لڑائی ہوئی تھی۔“

”اچھا تو یہ وہی ذات شریف ہیں۔“ نقاب پوش دلاور کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

دلاور خاں مسکرانے لگا۔

”تم نے یہاں ہڑ بونگ کیوں مچائی۔“ نقاب پوش تیز لہجہ میں بولا۔

”تمہارے کھلاڑی بے ایمانی کرتے ہیں۔“ دلاور خاں نے پرسکون لہجہ میں کہا۔

”بکواس ہے۔“ نقاب پوش نے کہا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔“

”یہ دوہرے تاش.....!“ دلاور اسے تاش کی دو گڈیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ ”شریفوں

کی جیب پر ڈاکہ ڈالو تو ایک بات بھی ہے ہم جیسے تو تم جیسوں کے لئے جیب میں ریوا اور بھی

موجود رکھتے ہیں۔“

”بڑے تیس مار خاں ہو!“ نقاب پوش طنزیہ لہجہ میں بولا۔

”میں تیس دو ناساٹھ مار خاں ہوں بیٹا۔“ دلاور خاں سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

نقاب پوش نے دلاور خاں کے منہ پر ایک گھونٹہ مار دیا، دلاور لڑکھڑا گیا۔ شاید وہ اس

کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ نقاب پوش نے دوسرا گھونٹہ مارا۔ پھر تیسرا اور پھر اس نے

گھونٹوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دلاور خاموشی سے پٹ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نقاب پوش ہانپنے لگا۔

”اچھا اب ایک میرا بھی سنبھالو۔“ دلاور نے اسے ست ہوتا دیکھ کر کہا۔ دلاور کا ہاتھ

پڑتے ہی نقاب پوش ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی

لیکن اب کی دلاور نے اس کی ٹھوڑی پر ایک لات رسید کی، نقاب پوش بلبلتا اٹھا۔

یہ دیکھ کر حمید کے ساتھی نے پستول نکال لیا، نہ جانے کس اچانک خیال کے تحت حمید نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھا دیا، گولی چل چکی تھی۔ بجلی کا بلب نشانہ ہو گیا اور سارے قحبہ خانہ میں

اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ ادھر ادھر ایک دوسرے سے

ٹکراتے پھر رہے تھے۔ کسی نے حمید کی کپٹی پر ایک گھونٹہ رسید کیا، وہ چکرا کر گرنے لگا۔ فوراً

کسی نے اسے سنبھال لیا اور اپنی پیٹھ پر لاد کر لے بھاگا۔ وہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اوپر سیزمی پر پہنچ

کر اس نے حمید کو اتار دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف آہستہ آہستہ ریٹگنے لگا۔

”چپ چپ چلے آؤ۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ حمید کا سر چھت سے ٹکرا رہا تھا۔

دونوں نے چھت ٹٹولنا شروع کی لیکن باہر جانے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ چھت سے تقریباً ایک فٹ

نیچے حمید کو چھت اور دیوار کے درمیان اتنی جگہ محسوس ہوئی جس میں ایک آدمی لیٹ کر باسانی

ریٹگ سکتا تھا۔ غالباً اس کے ساتھی نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا۔

”ادھر چڑھ چلو.....!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

دونوں اس دراز میں لے لے لیٹ گئے۔

”اب یہاں لیٹ کر کسی آنے والے کا انتظار کرنا چاہئے، یہاں دروازہ ضرور ہوگا ورنہ

زینوں کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”مگر اس طرح ہم لوگ دیکھ لئے جائیں گے۔“ حمید نے ہکا۔

”اچھا تو آگے کی طرف کھسکتا شروع کرو، دیکھیں ادھر کیا ہے۔“ وہ بولا۔ دونوں لیٹے

ہی لیٹے ریٹگنے لگے۔ تھوڑی دیر سرکنے کے بعد حمید نے عجیب قسم کی بدبو محسوس کی اور ساتھ ہی

پانی بہنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی۔

دلاور آگے تھا۔ دفعتاً وہ رک گیا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی نارنج نکال کر روشن

کی۔ آگے دو فٹ چوڑا اور تقریباً چار فٹ لمبا ایک گڑھا تھا۔ حمید اپنے ساتھی کو بخور دیکھ رہا تھا۔

”نیچے کوئی گندہ تالاب بہ رہا ہے۔“ اس نے حمید کی طرف مڑ کر کہا۔ ”مگر بدبو بہت

سخت ہے۔ اب چلو ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ ہم لوگ اس میں کود پڑیں کہیں نہ کہیں تو جا کر

نکلیں گے۔“

اور اگر کبھی یہ نالا آگے چل کر نالی ہو گیا تو کیا ہوگا۔“ حمید بولا۔

”اچھا، اور اگر یہاں پکڑے گئے تو کیسی خاطر ہوگی۔ یہ بھی سوچ لو میری جان۔ بچانے کے صلہ میں وہ تمہیں کافی کڑی سزا دیں گے۔ میرے خیال میں تو اس نالے میں گھٹ کر مرجانا کوئی اچھا نہ ہوگا۔“

”جیسی تمہاری مرضی.....!“ حمید نے بے بسی سے کہا۔

”اچھا تو پہلے میں کودتا ہوں۔“ یہ کہہ کر دلاور اس گڑھے میں اتر گیا۔ نیچے سے اس نے نارنج دکھائی اور حمید بھی کود پڑا۔ تقریباً چار پانچ فٹ چوڑا آدم نالا تھا۔ سارے شہر کا گندا پانی اس میں بہا کرتا تھا۔ حمید نے اپنی ناک مضبوطی سے دبا رکھی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ پانی حمید کی کمر تک تھا۔

”میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”گھبراؤ نہیں..... یہ نالا ہرگز نالی نہیں ہو سکتا ہے۔“

”لیکن ہم کب تک اس طرح چلتے رہیں گے۔ باہر نکلنے کی کیا صورت ہوگی۔“ حمید نے کہا۔

”تم نے سڑکوں پر بعض جگہ لوہے کی جھنجھریاں لگی ہوئی دیکھی ہوں گی۔ ان کا تعلق نالے سے ہے گھبراؤ نہیں۔“

تھوڑی دیر چلنے کے بعد پانی کی سطح پر روشنی کے کئی لہریے دکھائی دیئے۔

چلو جھنجھری بھی آگئی۔“ حمید نے کہا۔

”پاگل ہوئے ہو، اس جگہ کافی آمدورفت معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہاں اوپر نکلے تو اچھی خاصی حجامت بن جائے گی۔ تم تو خیر بچ ہی جاؤ گے لیکن میرے سلسلہ میں کافی چھان بین کی جائے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ میں جیل میں نظر آؤں گا۔“

”بھلا میں کیسے بچ جاؤں گا۔“ حمید نے کہا۔

”حمید میاں، تم مارواڑی کے بھیس میں مجھ سے نہ چھپ سکو گے۔“ دلاور خاں ہنس کر

بولا۔ ”خیر چلو..... میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اگر آج تم میرے پیچھے نہ لگتے تو میں دوسری دنیا میں ہوتا۔“

”کیا واقعی تمہارا تعلق ان لوگوں سے نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”ہرگز نہیں..... میں ان لوگوں سے بدلہ لئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔“

”آخر یہ لوگ ہیں کون۔“ حمید نے پوچھا۔ ”اور وہ نقاب پوش کون تھا۔“

”ناوٹی کا مالک سنتوش.....!“ دلاور نے کہا۔ ”یہ لوگ صرف یہیں تک محدود نہیں،

انہوں نے اپنا جال دور دور تک پھیلا رکھا ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو کل ہی.....“

”جی ہاں کل ہی آپ انہیں گرفتار کر لیں گے۔“ دلاور نے طویہ انداز میں کہا۔ ”ان کے

خلاف ثبوت کیسے مہیا کرو گے۔“

”تہہ خانہ اور اس کی غیر قانونی حرکتیں۔“ حمید نے کہا۔

”تو کیا تم اس تہہ خانہ میں دوبارہ پہنچ جانے کی امید رکھتے ہو۔“ دلاور نے کہا۔ ”کیا

تمہاری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی۔“

”ہم لوگ اسی نالے کی راہ سے حملہ کریں گے۔“ حمید نے کہا۔

”بہت خوب.....!“ دلاور نے ہنس کر کہا۔ ”وہ گڑھا اسی وقت پاٹ دیا جائے گا اور کل

تمہیں اس کا نشان تک نہ ملے گا۔“

”خیر چھوڑو.....!“ حمید نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے فریدی صاحب کو کیوں گرفتار کر رکھا ہے۔“

”فریدی کو آج چھوڑ دیا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”کیا وہ گھر نہیں پہنچا۔“

”نہیں.....!“ حمید نے کہا۔

”تو پھر مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ سنتوش کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔“

”نہیں.....!“ حمید نے کہا۔

”میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ آخرا ب کیا ہو رہا ہے۔“ حمید نے بے بسی سے کہا۔

”چیز ہی ایسی ہے کہ اسے سینٹھ اگر وال، فریدی، سنتوش اور میرے علاوہ کوئی اور جان بھی نہیں سکتا۔“

”اچھا تم نے فریدی کی تجویز سے کیا چیز غائب کی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”یہی تو ہمارا راز ہے، جو بتایا نہیں جاسکتا۔“ دلاور نے کہا۔ ”آخر فریدی نے تم سے کیوں چھپایا تھا۔“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا دیکھو وہ روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ جگہ سناں معلوم ہوتی ہے۔“ دلاور نے کہا۔
 حمید نے اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ جھنجھری سے دھندلی دھندلی روشنی آتی دکھائی دے رہی تھی۔
 سڑک کا یہ حصہ کافی ویران معلوم ہوتا تھا۔ حمید نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جھنجھری میں ٹکا دیئے اور زور لگانے لگا لیکن جھنجھری میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ دلاور ہنسنے لگا۔ اس نے حمید کو ایک طرف ہٹا دیا۔
 چند منٹوں کی جدوجہد کے بعد وہ جھنجھری کو اس کی جگہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔
 دونوں اچھل کر باہر آئے۔ جھنجھری پھر وہیں فٹ کر دی گئی۔ حمید سردی کی وجہ سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ لیکن دلاور پر کوئی خاص اثر نہ معلوم ہوتا تھا۔

”اچھا شکر یہ!“ دلاور نے حمید سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میری جان بچائی ہے۔“

”اور تم نے میری.....!“ حمید نے کہا۔ ”دونوں برابر ہو گئے۔“

”مطلب.....!“ دلاور ہنس کر بولا۔

”یہی کہ اگر آسانی سے کبھی میرے ہتھے چڑھ گئے تو چھوڑوں گا نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”لوٹو، ہو حمید میاں، چالیس سال سے آزاد پھر رہا ہوں ابھی تک تو کوئی مائی کالا ل

ایسا پیدا نہیں ہوا جو مجھے پکڑ سکے۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ حمید بولا۔ ”اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

ہینڈ زاپ

حمید نے دوسرے دن ساری روئیداد چیف انسپکٹر کو سنائی۔ وہ سناٹے میں آ گیا۔
 ”واقعی فریدی کی صحبت نے تم پر گہرا اثر ڈالا ہے۔“ چیف نے کہا۔ ”اُس وقت کوئی انسپکٹر بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”ذرا نوازی ہے آپ کی۔“

”اور مجھے حیرت ہے کہ آخر فریدی تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کیوں ڈالتا رہتا ہے۔“

”دراصل وہ یہ نہیں چاہتے کہ میں اُن سے الگ رہوں۔“ حمید نے کہا۔

”اچھی سنک ہے۔“ چیف نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے دلاور خاں کو کیوں نکل جانے دیا۔“

”اس وقت میں کر ہی کیا سکتا تھا۔“

”دیکھو یہ بہت اچھا موقع ہے۔ جب دو بد معاشوں میں کھٹ پٹ ہو جائے تو ہمیں اس

سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔“

”بہت اچھی طرح۔“

”تو آج رات کو ہم لوگ ناوٹنی چل رہے ہیں۔“ چیف نے کہا۔ ”تمہ خانہ میں پہنچنا تو

اب کافی محال ہے کیونکہ وہ لوگ اب کافی محتاط ہو گئے ہوں گے۔“

”یہ تو ہے۔“

”جب تک ہمارے پاس مکمل ثبوت نہ ہو ہم ان لوگوں کو گرفتار نہیں کر سکتے۔“ چیف نے

کہا۔ ”دلاور خاں پر بھی کسی نہ کسی طرح ہاتھ پڑنا ہی چاہئے۔“

”محال ہے۔“

”کیوں.....؟“

”بہت چالاک آدمی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ اس طرح آزادانہ کس طرح گھومتا پھرتا ہے۔“

”یہاں اسے کوئی پہچانتا نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”ایک صورت سے ہمیں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔“ حمید نے کہا۔
”وہ کیسے؟“

”فی الحال ہم لوگ اسے اپنے ساتھ ملا لیں وہ بھی ان لوگوں کا جانی دشمن ہو رہا ہے۔“
حمید نے کہا۔

”لیکن یہ ہوگا کیسے.....!“ چیف نے کہا۔

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“



اسی دن ناٹوٹی ہوئی کے ایک کمرے میں دلاور بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ یہ ایک بہترین طرز پر سجایا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دلاور نے طویل انگڑائی لیتے ہوئے گھڑی دیکھی اور سگار سلگا کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے صوفے کے تکیے سے لگ گیا۔ دفعتاً ایک آدمی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دلاور نے پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ آنے والا کچھ دیر تک اس کے پیچھے کھڑا اسے گھورتا رہا۔

”فرمائیے کیسے تکلیف کی۔ میرے لائق کوئی خدمت.....!“ وہ آدمی بولا۔ دلاور خاں ایک خاص انداز میں مسکرا کر پلٹا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”غالبا میں سنتوش بابو سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔“ دلاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تشریف رکھئے۔“ سنتوش نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”فرمائیے۔“

”تکلف برطرف۔“ دلاور تیز لہجہ میں بولا۔ ”میں اپنے کل رات کو ہارے ہوئے روپے واپس لینے آیا ہوں۔“

”ہارے ہوئے روپے!“ سنتوش نے متحیر ہو کر کہا۔ ”شاید آپ بھول رہے ہیں، ہمارے یہاں جو انہیں ہوتا۔ آپ کہیں اور ہارے ہوں گے۔“

”اور آپ کا دانت بھی کہیں اور ٹوٹا ہوگا۔“ دلاور نے طنزیہ لہجے میں کہا ”اور آپ کی شوڑی پر ٹھوکر بھی کہیں اور پڑی ہوگی۔“

”آپ نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ سنتوش نے کہا۔ ”شاید آپ زیادہ پی گئے ہیں۔“
”ممکن ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”لیکن اتنا یاد رکھنا کہ داڑھی خاں پنپاوری سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔“ دلاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سنتوش آنکھیں پھاڑے ہوئے اُسے گھور رہا تھا۔

”تو استاد پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا تھا۔“ سنتوش نے آہستہ سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

”تم نے پوچھا کب تھا.....!“ دلاور نے لاپرواہی سے کہا۔

”تو آپ ادھر کب سے آئے۔“

”حال ہی میں آیا ہوں اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں سینٹھ اگر وال کیلئے کام کر رہا ہوں۔“
”سمجھا..... لیکن آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوگا، جب کہ میرے علاوہ اور کوئی دوسرا اس چیز کے راز سے واقف نہیں۔“

”تو وہ چیز تمہیں نے اڑائی تھی۔“

”نہیں..... مجھ سے پہلے ہی کوئی اڑا لے گیا اور اسی رات کو جب میں نے بھی اس کے لئے کوشش کی تھی۔“

”اور پھر تم نے اسی جھلاہٹ میں اگر وال پر گولی چلا دی۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“ سنتوش بے ساختہ بولا۔

”مجھ سے اس شہر کے کسی بد معاش کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔“

”تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ چیز کون لے گیا۔“

”ابھی تو نہیں لیکن میں اس کا پتہ جلد لگا لوں گا۔“

”آپ وہ چیز اس سے حاصل کر کے سیٹھ اگر وال کو دے دیں گے۔“

”ہاں.....!“

”اگر آپ اس چیز کے راز کو جانتے ہوتے تو کبھی ایسی بات نہ کہتے۔“ سنوٹش نے کہا۔

”خیر سیٹھ اگر وال اسے دوبارہ پا جانے پر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔“

”میں اسے سمجھ سکتا ہوں لیکن مجھے اس سے کیا۔ میں اسے اس کے حوالے کر کے اس سے

مناسب معاوضہ وصول کر لوں گا۔“

”کوئی اس کی قیمت لگا ہی نہیں سکتا۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”اگر آپ یہ بھی جانتے ہیں تو پھر اسے حاصل کر کے میرے حوالے کر دیجئے۔“

”آدھے آدھے کی رہی۔“

”چلو منظور۔“ دلاور نے کہا۔ ”لیکن پہلے مجھے وہ تعویذ دکھا دو۔“

”ارے.....!“ سنوٹش چونک کر بولا۔ ”تو کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں۔“

”میں کیا نہیں جانتا۔“ دلاور بولا۔ ”لاؤ اسے جلدی لاؤ، ورنہ سب معاملہ عنقریب گڑبڑ

ہو جائے گا۔“

سنوٹش کچھ سوچنے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ پٹھان بات کے پکے ہوتے ہیں۔“ سنوٹش نے کہا۔ ”میں آپ کو وہ

تعویذ دکھا تو دوں لیکن میری ساتھ دغا نہ کیجئے گا۔“

”دغا تو میں سیٹھ اگر وال کے ساتھ بھی نہ کروں گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ سنوٹش چونک کر بولا۔

”کیا واپسی کا وعدہ کیا ہے، وہ چیز اسے واپس کی جائے گی۔ یہ

اور بات ہے کہ گودا ہمارا ہوا اور چھلکا اُس کا۔“

سنوٹش نے قہقہہ لگایا۔

”مانتا ہوں استاد.....!“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر جانے لگا۔

”ٹھہرو.....!“ دلاور نے کہا۔ ”یہ بھی سن لو کہ میں صرف ایمانداروں کے ساتھ

ایمانداری برت سکتا ہوں۔“

”اس سے آپ مطمئن رہئے۔ میری بات بھی سچی ہی ہوتی ہے۔“

سنوٹش چلا گیا۔ دلاور نے بجھا ہوا سا گارسلگایا اور آنکھیں بند کر کے صوفہ پر نیم دراز ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد سنوٹش لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک تھیلی تھی۔

”یہ لیجئے۔“ سنوٹش نے بیٹھے ہوئے کہا۔

دلاور نے تھیلی کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور اسے بخور دیکھتا رہا۔

پھر سنوٹش کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال سے اسے جلا دو۔“

”کیوں.....؟“

”اسلئے کہ جو شخص وہ چیز اگر وال کے یہاں سے لے گیا ہے وہ اس کی فکر میں بھی ہوگا۔“

”ارے تو اب ایسا کوئی نہیں کہ سنوٹش کے قبضہ سے اسے نکال لے جائے۔“ سنوٹش

نے آکر کر کہا۔

”کرنے لگے وہی بچپنے کی باتیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”فرض کرو کہ میں نے ہی اس چیز کو

چرایا ہو اور اس وقت میں نے تمہیں دھوکہ دے کر اس کی دوسری کڑی بھی معلوم کر لی۔“

سنوٹش نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

”اچھا میں آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔“ سنوٹش نے کہا۔

”تو اب میں چلتا ہوں، رات کو کسی وقت آؤں گا اور ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ یہاں کے

جاسوس کی تم پر کڑی نظر ہے۔ کل تو ایک تمہارے تہہ خانہ میں بھی پہنچ گیا تھا۔“ دلاور نے کہا۔

”مجھے سب معلوم ہے۔ تہہ خانہ کا راستہ ان کے باپ کو بھی نہیں معلوم ہو سکتا اور یہاں

اور کوئی ایسی چیز نہیں جسکی بناء پر وہ مجھے ہاتھ لگا سکیں، ان سے تو میں اچھی طرح پنٹ لوں گا۔“
دلاور سنتوش سے ہاتھ ملا کر باہر چلا آیا۔



اسی رات کو حمید اور چیف ناٹوٹی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ چیف کا بگلہ شہر کے باہر واقع تھا۔ اس لئے شہر جانے کے لئے انہیں سڑک کا ایک بہت بڑا ویران حصہ طے کرنا پڑتا تھا۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے تھے۔ ٹیکسی کی روشنی تاریک رات کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ آج انہیں ایک ٹیکسی اس غیر آباد علاقہ میں مل گئی، ورنہ انہیں پیدل ہی آنا پڑتا۔ فریدی کی کار جو حمید کے استعمال میں رہتی تھی وہ آج پھر خراب ہو گئی تھی۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں سچ سڑک پر ایک آدمی ہاتھ اٹھائے ہوئے کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے چتر کے کالر کھڑے کر رکھے تھے اور نائٹ کیپ آگے کی طرف اس طرح جھکا رکھی تھی کہ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈرائیور نے اسکے قریب پہنچ کر ٹیکسی روک دی۔ وہ شخص کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”پینڈز اپ.....!“ اس نے ریوالور نکال کر ٹیکسی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

”تم دونوں نیچے اتر آؤ.....“ پراسرار اجنبی نے حمید اور چیف انسپکٹر سے جھکمانہ لہجہ میں کہا۔

دونوں خاموشی سے ہاتھ اٹھائے ہوئے نیچے اتر آئے۔

”جاؤ بیٹا۔“ پراسرار اجنبی نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اپنے استاد سے کہہ دینا کہ میرے شکار

پر ہاتھ نہ ڈالا کرے ورنہ اچھانہ ہوگا“

ڈرائیور نے گاڑی اشارت کر دی۔ اجنبی نے دو تین ہوائی فائر کئے اور ٹیکسی نظروں سے

غائب ہو گئی۔ اب وہ اجنبی ان دونوں سے مخاطب ہوا۔

”ناٹوٹی ہوٹل اچھی جگہ نہیں..... خصوصاً شرفاء کے لئے۔“ اس نے کہا۔

”تم کون ہو۔“ حمید گرج کر بولا۔ ”خیریت اسی میں ہے کہ ریوالور جیب میں رکھ لو۔“

”ناراض ہونے کی ضرورت نہیں سرکار..... یہ لیجئے۔“ اجنبی نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

”آخر تم ہو کون.....؟“ چیف نے پوچھا۔

”دوست“ یہ کہہ کر اجنبی نے سگریٹ سلگانے کی دیا سلائی جلائی اور حمید کے منہ سے

بیساختہ نکلا۔

”فریدی صاحب.....؟“

”فریدی.....!“ چیف نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا.....؟“

”بس چپ چاپ گھر کی طرف چلے چلئے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آپ لوگ گئے

تھے ہاتھ سے۔“

وہ تینوں واپس جانے کے لئے مڑے۔

”آخر بات کیا ہے۔“

”اس سنسان راستہ پر کبھی اور بھی آپ کو کوئی ٹیکسی ملتی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں..... لیکن اس سے کیا بحث۔“

”یہی تو خاص چیز ہے۔ آپ لوگوں کو غائب کرانے کا پروگرام بنایا گیا تھا، بد معاشوں کو

کسی طرح اطلاع مل گئی تھی کہ آج آپ لوگ ناٹوٹی میں آنے والے ہیں۔ اس لئے انہوں نے

پہلے ہی سے آپ کی سواری کا انتظام کر دیا تھا۔“

”تمہیں ان سب باتوں کی اطلاع کیسے ہوئی۔“ چیف نے کہا۔

”ظاہر ہے کہ میں اتنے دنوں تک محض جھک نہیں مار رہا تھا۔“

”وہ کچھ سہی..... لیکن تم کسی نہ کسی دن اپنی جان خطرے میں ضرور ڈال لو گے۔ آخر اس

طرح کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”اپنا اپنا طریقہ کار ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے خطروں سے کتنا پیار ہے۔“

فریدی بولا۔

”مگر مجھے تمہارا یہ طریقہ پسند نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”پرسوں رات کو نو بجے کم از کم پچیس جوان سادے لباس میں لے کر ناوٹی پہنچ جائیے گا اور وہاں اگر دلاور سے مذہبھیڑ ہو جائے تو اسے فی الحال نظر انداز کر نیکی کوشش کیجئے گا ورنہ سب معاملہ گڑبڑ جائے گا۔ اچھا تو اب میں چلا۔ اب سنتوش کی گرفتاری کے بعد ہی ملاقات ہوگی۔“

چیف کا بنگلہ قریب تھا۔ فریدی واپس لوٹنے کے لئے مڑا۔

”سنئے تو سہی۔“ حمید نے بے قراری سے کہا۔

”نہیں اس وقت نہیں..... تمہیں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرے بتائے ہوئے وقت سے پہلے ناوٹی کے قریب بھی جانے کی ضرورت نہیں۔“ فریدی نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

عجیب و غریب عشق

فریدی کے بتائے ہوئے پلان کو شام ہی سے ایک ایک دو دو کر کے پولیس کے مسلح عہدہ سادے لباس میں ملبوس جوان ناوٹی میں اڈہ جمانے لگے۔ فریدی کی ہدایت کے مطابق وقت سے پہلے کسی نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے ناوٹی والوں کو ہوشیار ہو جانے کا اشارہ ملتا۔ نو بجے رات تک جوانوں کی مقررہ تعداد ناوٹی میں پہنچ گئی۔ چیف اور حمید بھی بھیس بدلے ہوئے وہاں موجود تھے۔

ہر شخص اپنی جگہ پر کسی چیز کا منتظر تھا۔ لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ چیف اور حمید کی نگاہیں فریدی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”فریدی تو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“ چیف نے آہستہ سے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”نہ جانے آئندہ ان کی اسکیم کیا ہے۔“

”کہیں مفت کی دردسری نہ ہو۔“ چیف بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ لیٹھ کس ہی ایسے ہوتے ہیں کہ مجھے تہا کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔“

”خیر بھئی..... تم جانو، سمجھانا میرا کام ہے۔“ چیف نے کہا۔ ”اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس ڈرائیور کو یونہی کیوں نکل جانے دیا۔“

”ابھی فی الحال اسے گرفتار کر لینا ٹھیک نہیں تھا۔“

”کیوں.....؟“

”میں نے اس وقت اس سے ایک ڈاکو کی حیثیت سے بات کی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”معاملات حد درجہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ بد معاشوں کی دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہے۔ ان میں سے ایک پارٹی سنتوش کی ہے اور دوسری ان لوگوں کی ہے جنہوں نے سیٹھ اگر وال کے یہاں ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس دن یہ واردات ہوئی تھی اس دن سنتوش اور ان کے ساتھیوں نے بھی سیٹھ اگر وال کے گھر میں گھسنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ لوگ ان دونوں کے بعد آئے تھے اور سنتوش ہی کی گولی سے سیٹھ اگر وال زخمی بھی ہوا تھا۔“

”لیکن یہ آج تک میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”یہ تو ابھی تک مجھے بھی نہیں معلوم ہوسکا لیکن سنتوش کو قانون کی زد میں لانے کے لئے میرے پاس بہت سے ثبوت ہیں۔“

”اور ایک دلچسپ بات اور سنو.....!“ چیف نے کہا۔ ”آج کل دلاور خاں پھر دکھائی دے رہا ہے اور جس وقت تمہارے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا وہ پولیس کی غائب کی ہوئی لاری پر دیکھا گیا تھا۔“

”جی ہاں..... وہی تو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس سے تو مجھے خاص طور پر پتہ ہے۔ لیکن ابھی نہیں، سنتوش کی گرفتاری کے بعد اس سے بھی سمجھ لوں گا۔ فی الحال اس سے الجھنا نہیں چاہئے، اس میں بھی ایک راز ہے۔“

”بھئی اپنی باتیں تم ہی سمجھو.....!“ چیف نے اکتا کر کہا۔

”یہ ناممکن ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”فریدی بے بنیاد چیزوں پر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔“

”خیر اب تو آئی گئی ہیں، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”ہاں..... دیکھئے۔“ حمید نے کہا۔

”یہ بات بھی عجیب و غریب ہے۔“ چیف نے کہا۔ ”دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ کچھ کوئی عورت کھڑی ہو۔“

”عجیب قسم کا رنگ و روغن ہے اس کے چہرے پر۔“ حمید نے کہا۔

ابھی ان دونوں میں یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ دفعتاً کوئی آدمی نہایت بھدی اور بے ہنگم آواز میں گانے لگا۔ ہر فرد اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دلاور خاں نشہ میں دھت ہاتھ میں ایک خالی بوتل لئے لڑکھڑاتا اور گاتا ہوا ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے پر رک کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ایک قہقہہ لگا کر پھر گانے لگا۔ وہ اپنی مادری زبان پشتو میں کوئی گیت گارہا تھا۔

ہوٹل کا منیجر گھبرا کر اس کی طرف دوڑا۔ وہ اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔

”میں تو گاؤں گا.....!“ دلاور خاں سچ کر بولا۔ ”دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا کرتا ہے۔ میں تمہارے مالک سنٹوش بابو کا دوست ہوں۔“

”گانے دو بھائی گانے دو.....!“ کئی مدھوش شرابی چیخے۔

”جیو میرے ساتھیو..... جیو۔“ دلاور خان نے جھومتے ہوئے کہا۔ ”ہم ہی جیسوں کے دم سے دنیا قائم ہے ورنہ کبھی کی قیامت آگئی ہوتی۔“

چند شرابیوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”میرے پیارے بھائیو.....!“ دلاور خان بت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں اس عورت پر مرتا ہوں یہ میری محبوبہ ہے۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔“ بیک وقت بہت سی آوازیں آئیں۔

”معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ پی لی ہے۔“ چیف انسپکٹر نے حمید کی طرف جھک کر آہستہ

سے کہا۔

”جی ہاں، بُری طرح ڈاؤن ہے۔“ حمید بولا۔

”مگر فریدی اب تک نہیں آیا۔“ چیف نے کہا۔

”معلوم نہیں کیا بات ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں تو پیارے بھائیو۔“ دلاور پھر چیخا۔ ”میں جادوگر ہوں، کالا جادوگر..... میں ایک منٹ میں مرغی سے انڈا اور انڈے سے مرغی بنا سکتا ہوں۔ خرگوش میں سے ہیٹ نکال سکتا ہوں۔“

”خرگوش میں سے ہیٹ۔“ ایک آدمی ہنستا ہوا چیخا۔

”نہیں، ہیٹ میں سے خرگوش.....!“ دلاور چیخا۔ ”دیکھئے میرا کمال، یہ دیکھئے یہ ایک انڈا ہے، بتائیے اسے کیا بنا دوں۔“

”ہاتھی.....!“ ایک آواز آئی۔

”نہیں..... خرگوش.....!“ دوسری آواز سنائی دی۔

”نہیں بھائی اود بلا۔“ تیسرا چیخا۔

”اچھا تو میں اسے توڑ کر پئے لیتا ہوں۔“ دلاور نے انڈا توڑ کر حلق میں انڈے پلٹے ہوئے کہا۔ ”اب یہ تھوڑی دیر کے بعد ہضم ہو جائے گا، کہنے ہے ناکمال۔“

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

”ہاں تو بھائیو.....!“ وہ اسی چہوتے پر بیٹھتے ہوئے بولا جس پر بت نصب تھا۔ ”میں اس عورت پر عاشق ہوں، لیکن یہ بڑی سنگدل ہے۔ میری قطعی پرواہ نہیں کرتی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے عشق میں گھل گھل کر مر جاؤں گا۔“

اس نے بت کے پیروں سے لپٹکر بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ سارے لوگ ہنسی کے مارے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

”آپ لوگ ہنستے ہیں۔“ وہ رونی آواز میں بولا۔ ”خدا کرے آپکو بھی کسی سنگدل سے عشق ہو جائے۔ میرا دادا اس کے عشق میں مر گیا، میرا باپ اس کے عشق میں مر گیا اور اب میں بھی

اس کے عشق میں مریاں گا۔ وہ پھر اسکے پیروں سے لپٹ کر اسکے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
دھننا ایک کھٹکا ہوا اور وہ بت کھسک کر ایک طرف ہو گیا جس جگہ وہ نصب تھا۔ وہاں ایک
غار پیدا ہو گیا اور دلاور خاں اسی غار میں گر کر غائب ہو چکا تھا۔ حمید نے سیٹی بجائی۔ سارے
جوانوں نے اپنے اپنے پستول نکال لئے۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔“ ایک سب انسپکٹر چیخا۔

”بیز جی تم پانچ جوانوں کے ساتھ یہیں ٹھہرو.....!“ چیف انسپکٹر بت کی طرف بڑھا۔

”سب دروازے بند کرالو کوئی باہر نہ جانے پائے اور بقیہ لوگ میرے ساتھ آئیں۔“

یہ غار ایک تہہ خانے کا راستہ تھا۔ وہ سب تہہ خانہ میں اتر گئے۔ تہہ خانہ میں حسب دستور
جواہر ہاتھ۔ ناجائز شراب، افیون، چائڈ اور کوکین فروخت ہو رہی تھی۔ شہر کی عیاش طبع متمول
عورتیں عیش کر رہی تھیں پولیس والے آہستہ آہستہ سارے تہہ خانے میں پھیل گئے۔ دلاور خاں
کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سنٹوش کو بہت جلد اس کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ
تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ آہستہ آہستہ سنٹوش کی پارٹی سست ہوتی جا رہی تھی۔
اس دوران میں سنٹوش بری طرح زخمی ہو گیا۔ آخر کار فوج پولیس کی ہوئی اور سارے بد معاش
پکڑ لئے گئے۔ لیکن سنٹوش غائب تھا۔ اس کی تلاش برابر جاری تھی۔ دھننا ایک کمرے سے گولی
چلنے کی آواز آئی۔ حمید کمرے کی طرف لپکا لیکن فوراً ہی وہ باہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے۔“ چیف نے پوچھا۔

”سنٹوش نے خودکشی کر لی۔“ حمید نے بتایا۔

ڈاکو پولیس کی لاری میں بھر کر کوٹوالی کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ ایک کار میں
حمید، چیف اور بیز جی بیٹھے تھے۔

”دلاور خاں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔“ چیف نے ہکا۔

”معلوم نہیں اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔“ حمید نے کہا۔ ”میں نے تو اتنا پراسرار

اور بھیا تک آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

”خیر وہ اگر یہاں رہ گیا تو بیخ کرنے جا سکے گا۔“ چیف نے کہا۔



اسی رات کو چیف اور حمید فریدی کی کوشی میں بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔

”فریدی کا کچھ پتہ نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”کہیں وہ دلاور خاں کے پیچھے ننگ گئے ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”کون جانتے۔“ چیف بولا۔

”دیکھئے کب واپس ہوتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”آج سے دس سال قبل دلاور خاں کے لئے حکومت نے دس ہزار روپے کا انعام رکھا

تھا۔ جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ فریدی اسے حاصل کر سکی ضرور کوشش کریگا۔“ چیف نے بتایا۔

”جی ہاں ضرور۔“ کمرے کے باہر سے آواز آئی اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

حمید اور چیف کے سامنے دلاور کھڑا تھا۔

”پنڈر اپ۔“ حمید نے پستول نکال کر کہا۔

دلاور خاں ہنسنے لگا۔

”شاباش میرے لال.....!“ دلاور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”بچ پوچھو تو میں تمہاری ہی

گولی کا نشانہ بننے کی امید پر اب تک جی رہا ہوں۔“

چیف اور حمید حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہ رہ گئی تھی کہ

منہ سے آواز تک نکال سکتے۔

”کیوں حمید..... میرے احسان کا بھی بدلہ ہے۔“ دلاور مسکرا کر بولا۔ ”اگر میں آج

تمہاری رہنمائی نہ کرتا تو تمہارے فرشتوں کو بھی تہہ خانہ کا راستہ نہ معلوم ہو سکتا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ اس احسان کے بدلے میں ایک بھیا تک خونی کو چھوڑ دیا

جائے۔“ چیف نے کہا۔

”اچھا تو لیجئے خادم حاضر ہے۔“ دلاور زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

حمید نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں جھکڑیاں لگا دیں۔ وہ بدستور اسی طرح بے حس

و حرکت بیٹھا رہا۔

”آپ یہیں ٹھہریے میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”ارے..... ارے۔“ دلاور خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”فریدی.....!“ چیف حیرت سے بولا۔

”ارے آپ.....!“ حمید بھونچکا رہ گیا۔

فریدی نے قہقہہ لگایا۔ گھسی مونچھیں اس کے پیروں کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔

”بھئی خدا کی قسم کمال کر دیا تم نے۔“ چیف نے اس کی پیٹھ ٹھوکے ہوئے کہا۔

”سب محبت ہے آپ کی۔“

”تو کیا شروع ہی سے دلاور خاں کا رول ادا کر رہے تھے۔“ چیف انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی ہاں..... اگر یہ نہ کرتا تو اس تہہ خانہ تک رسائی ناممکن تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”میں کئی راتوں سے نہیں سو رہا، سخت نیند لگ رہی ہے۔ انشاء اللہ کل ساری داستان سناؤں گا۔“

چیف انسپکٹر تھوری دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

تجوری کا راز

حمید نے دوسرے دن صبح ہی صبح فریدی کے کان کھانے شروع کر دیئے۔ وہ سارے

واقعات جاننے کے لئے بُری طرح بے تاب تھا۔

”ارے بھی تم تو جان کو آگئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ ایک لمبی داستان ہے۔ کہاں تک

سناؤں گا۔ بہر حال سنو! مگر یہ بتاؤ پہلے تجوری کا راز بیان کروں یا اس مرتبہ کے طریقہ سراغ

رسائی پر روشنی ڈالوں۔“

”نہیں..... پہلے میں اس چیز کے متعلق سنوں گا جس کی بدولت یہ سب کچھ ہوا ہے۔“

حمید نے کہا۔

”اچھا سنو..... شاید تم نے نام سنا ہو۔ یہاں ایک بہت بڑے تاجر رام کمار جی تھے۔

میں ان کا نام اتنے ادب سے اس لئے لے رہا ہوں کہ وہ میرے والد صاحب مرحوم کے

گھر سے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۳۰ھ میں اچانک ان کا دیوالہ نکل گیا۔ یہ چیز بڑی حیرت

انگیز تھی۔ وہ شخص جس کے ایک اشارے پر لاکھوں کے وارے تیار ہوتے تھے بظاہر کوڑی

کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ یہ سیٹھ اگر وال جو آج سارے شہر کا رئیس التجار بنا بیٹھا ہے ان کے یہاں

مقیم تھا۔ ان کے دیوالہ نکالنے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے چپکے ہی چپکے اپنا گھر بھر لیا۔

جس وقت رام کمار جی کا دیوالہ نکلا ان کے بسر اوقات کے لئے صرف تھوڑی سی جائیداد باقی بچی

جو ان کی بیوی کے نام تھی۔ اس سے ان کی بسر اوقات ہونے لگی۔ ان کا ایک سالہ بچہ بھی تھا۔

دیوالہ ہو جانے کے صدمہ کی وجہ سے وہ زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکے۔ مرتے وقت انہوں نے

ایک وصیت نامہ مرتب کر کے اپنے قانونی مشیر کے یہاں رکھوا دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ یہ

وصیت نامہ اس وقت ان کے بچے کے حوالے کیا جائے جب وہ بالغ ہو جائے۔ اور اگر وہ مر گیا

تو وصیت نامہ اس کی بیوی کو دیا جائے۔ اگر اس کی حیات بھی وفانہ کرے تو پھر یہ وصیت نامہ

اس کے بیٹے سنتوش کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہی سنتوش جس نے کل رات خودکشی کی ہے۔ یہ

رام کمار جی کا بھتیجا تھا۔ بچپن ہی سے بُری صحبتوں میں پڑ جانے کی وجہ سے وہ بڑا ہو کر اچھا

خاصا ڈاکو بن گیا۔

رام کمار جی کے انتقال کے بعد ان کی بیوی اور بچے کی پرورش اسی جائیداد سے ہوتی رہی

اور ہاں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ رام کمار جی ایک تعویذ اپنے بچے کے گلے میں ڈال گئے تھے

جس کے متعلق انہوں نے اپنی بیوی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسے اس وقت کھول کر دیکھیں جب بچہ جوان ہو جائے۔

دو تین سال کے بعد دفعتاً ایک دن رام کمار جی کے قانونی مشیر نے ان کی بیوی کو اطلاع دی کہ اس کے یہاں چوری ہو گئی۔ چوری ہونے والی چیزوں میں رام کمار جی کا وصیت نامہ بھی تھا۔ ان کی بیوی کو سخت پریشانی ہوئی۔ وہ وصیت نامہ ان کے لئے ایک عمر سے کم نہ تھا۔ کیونکہ بظاہر رام کمار جی کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہ تھی جس کیلئے وہ کوئی وصیت نامہ مرتب کرتے۔ جائیداد خود ان کے نام تھی۔ اس لئے اس کے سلسلہ میں کسی قسم کی وصیت کا سوال ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ اس الجھن کے تحت انہوں نے بیچے کے گلے میں پڑا ہوا پر اسرار تعویذ قبل از وقت ہی کھول ڈالا۔ اس تعویذ کے ذریعہ انہیں پتہ چلا کہ وصیت نامہ میں کسی خزانے کا ذکر تھا۔ لیکن تعویذ میں لکھی ہوئی ہدایت کے مطابق وصیت نامہ کو پڑھے بغیر خزانہ کا پتہ چلنا دشوار تھا۔ انہیں ایک گونہ اطمینان ہو گیا کہ بغیر اس کے وصیت نامے کا جانے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ انہوں نے تعویذ بیچے کے گلے سے کھول کر احتیاط سے رکھ دیا۔ چار ماہ قبل کی بات ہے کہ اچانک ایک دن کسی نے ان کے کس کا تالا توڑ کر تعویذ نکال لیا۔ ان کی پریشانیوں کی حد نہ رہی۔ وہ مجھے جانتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور سارا واقعہ بتا کر طالب امداد ہوئیں۔ رام کمار جی کی ساری شفقتیں یاد آ گئیں۔ وہ مجھے بھی اپنے بچہ ہی کی طرح پیار کرتے تھے۔ میں نے ان کی بیوی سے وعدہ کیا میں حتی الامکان کوشش کروں گا اور اسی دن سے میں نے تحقیقات شروع کر دیں۔ کئی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ وصیت نامہ سینٹہ اگر وال نے رام کمار جی کے قانونی مشیر کے یہاں سے چوری کروایا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر باضابطہ کارروائی کر کے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو کامیاب نہ ہو سکوں گا اس لئے میں نے وہ طریقہ کار اختیار کیا۔ چونکہ چیز چوری کی تھی اس لئے سینٹہ اگر وال نے بھی پولیس کو بیان دیا کہ اس کی کوئی چیز چوری نہیں کی گئی ہے۔

اس کے بعد سے مجھے اس چیز کی بہت زیادہ تشویش ہو گئی تھی کہ آخر اس پر گولی کس نے

چلائی۔ اسی دوران میں جب میں جگدیش کو بیوقوف بنانے کے لئے کار سے اتر گیا تھا مجھے چند نامعلوم لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑے۔ میں نے انہیں اور پولیس کو لڑنے میں الجھا دیا اور خود پولیس کی لاری لے کر فرار ہو گیا۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کام کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اس چیز کے پتہ لگانے کی تھی کہ آخر سینٹہ اگر وال کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے جو اس وصیت نامہ میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کا احساس ہونے لگا کہ یہ سنٹوش کی حرکت ہے اور اسی نے وہ تعویذ بھی چرایا ہے۔ لیکن وصیت نامہ ہاتھ نہ لگنے کی وجہ سے بالکل بے بس ہے چونکہ اس سے اس چیز کو اگلوانا تھا۔ اس لئے میں نے دلاور خاں کا بھیس بدلا اور سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ وصیت نامہ اپنی تجوری سے نکال لے گیا۔ اس دن مجھے تم پر بہت ہنسی آئی تھی جب تم برآمدے میں پھیلے ہوئے پٹاخوں پر اچھل کود رہے تھے۔ وہ میں نے دراصل اسلئے ڈالے تھے کہ جس وقت میں وصیت نامہ نکالنے میں مشغول ہوں تو مجھے آنے جانے والوں کی آہٹ مل سکے۔ سب سے پہلے تم ہی ان پٹاخوں کا شکار ہوئے۔ بعد کے واقعات سے تو تم واقف ہی ہو۔ ایک دن میں نے سنٹوش کو بلا کر وہ تعویذ دیکھ ہی لیا۔ اس کا نقشہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ اس کے مطابق وہ خزانہ اسی مکان میں ایک جگہ دفن ہے جہاں رام کمار جی کی بیوی رہتی ہے۔ اب ذرا تھکن دور ہو جائے تو میں جا کر وہ خزانہ کھدوانے میں ان کی مدد کروں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں نے وہ وصیت نامہ چرا کر اگر اس کے حقداروں کے پاس پہنچا دیا تو کون سا جرم کیا۔ اگر یہ جرم ہے بھی تو میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔“

”اچھا یہ تو بتائیے فریدی صاحب کہ آپ اتنے طاقتور کب سے ہو گئے ہیں۔“ حمید بولا۔

”ارے میاں اسے پوچھ کر کیا کرو گے۔ یہ سب راز کی باتیں ہیں۔ ایک اچھے سراغ

رساں میں یہ ساری خصوصیات ہونی چاہئیں۔“

”سنٹوش نے تو خود کشتی کر لی۔ اب اس کیس میں کیا ہوگا۔“ حمید نے دریافت کیا۔

”کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن میرے پاس اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سینٹہ اگر وال پر سنٹوش

عی نے گولی چلائی تھی اور اب سے تین سال قبل اس نے ایک خون بھی کیا تھا۔“ فریدی نے انکشاف کیا۔

”اچھا تو کیا آپ اس وصیت نامہ کا بھی تذکرہ کریں گے۔“

”کیا احمقوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اب جبکہ سنتوش مرچکا ہے اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ سیٹھ اگر وال میں اتنی ہمت نہیں کہ اب وہ اس کیس پر از سر نو روشنی ڈالے کیونکہ اس نے وصیت نامہ قطعی غیر قانونی طور پر حاصل کیا تھا۔ لہذا اب اس کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں رہ جاتا..... اچھا بھئی اب بس.....! کیا اب تک چائے نہیں بنی.....؟“

تمام شد